Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1965

رسول اللہ ؐ کا ارشاد ہے :

جو شخص کسی ظالم کی مدد کے لئے نکلا ، در آنحالیکہ وہ جانتا ہے کہ وہ شخص ظالم ہے تو وہ اسلام سے خارج ہو گیا ۔

پھر فرمایا :

اگر کسی شخص نے حاکم کو راضی کرنے کے لئے کوئی ایسی بات کہی جس سے خدا ناراض ہو جائے (یعنی وہ خدا کے کسی حکم کے خلاف ہو) تو وہ بھی اللہ کے دین سے نکل جائیگا ۔

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک
پاک و ہند سے
سالانہ ——— دس روپے
غیر ممالک سے
سالانہ ——— ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاک و ہند سے
ایک روپیہ

ٹیلیفون:- ۸۰۸۰۰

خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی- گلبرگ- لاہور

جلد ۱۸ | اگست سنہ ۱۹۶۵ء | نمبر ۸

فہرست مضامین

لمعات ——— ۲
جرم اور سزا ——— (قرآنک سٹڈی سرکل میں ایک سوال کا جواب) ——— (پرویز) ——— ۱۰
اسلامی مملکت کے فرمانروا ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۱۷
فتنہ بابی اور صحابہ کبارؓ ——— (محترم رفیع اللہ صاحب) ——— ۴۱
رابطۂ باہمی ——— ۴۶
باب المراسلات ——— (۱) تعمیر کا اختلاف (۲) احادیث میں جنت کی تفصیل ۴۹
سرسیدؒ کی مخالفت ——— ۵۷
بچوں کا صفحہ ——— ۷۰
حقائق و عبر ——— (۱) اولیاء اللہ (۲) حقیری میں بادشاہی (۳) مومن کی دولت (۴) بائبل (۵) محبوب سبحانی کا طریقۂ نماز۔ ۷۳
طاہرہ بیبی کا جواب ——— ۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

آئین پاکستان (۱۹۶۲ء) کی سے دفعہ ۱۹۹ کے ماتحت ایک "اسلامک آئیڈیالوجی کی مشاورتی کونسل" کا انعقاد عمل میں لایا گیا تھا۔ اس کونسل کا اولیں فریضہ یہ تھا کہ

> وہ اس امر کی سفارشات کرے کہ (وہ کونسے طریقے اختیار کئے جائیں جن کی رو سے) مسلمانانِ پاکستان اس قابل ہوسکیں کہ وہ اپنی زندگی بتمامہٖ اسلامی اصولات اور تصورات کے مطابق بسر کرسکیں۔

کونسل کا انعقاد ۱۹۶۲ء ہی میں عمل میں آگیا تھا اور ملک ہمہ تن انتظار تھا کہ وہ سفارشات سامنے آئیں جن کے مطابق یہاں کے مسلمان اسلام کے مطابق زندگی بسر کرسکنے کے قابل ہوسکیں، اس لئے کہ مملکتِ پاکستان کے مقصود و منتہیٰ ہی یہی تھا۔ اسی کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا اور اسی کے لئے اس کے استحکام کی خاطر افرادِ مملکت ہر ممکن قربانی کے لئے تیار ہیں۔ یعنی یہ مسئلہ کوئی فرعی یا ہنگامی نہیں تھا بلکہ مملکتِ پاکستان کے وجود کی اصل و بنیاد تھا۔ لہٰذا اس کی اہمیت واضح ہے۔ تین سال کے انتظار کے بعد، کونسل نے اپنی سفارشات مرکزی حکومت کو بھیجی ہیں۔ اس امر کا انکشاف، محترم وزیرِ قانون نے، پارلیمان میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا۔ ہمارے سامنے یہ سفارشات، روزنامہ پاکستان ٹائمز کی ۱۱ جولائی ۱۹۶۵ء کی اشاعت کی رو سے آئی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی سفارش یہ ہے۔

> ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے (جس کا نام ادارہ امور مذہبیہ ہو) جس کا فریضہ یہ ہو کہ وہ مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی میں اسلامی اقدار کو عملاً نافذ کرے، اور جملہ اسلامی ارکان بالعموم، اور بالخصوص صلوٰۃ، تنظیم المساجد، زکوٰۃ، بیت المال ــــ

امر بالمعروف۔ نہی عن المنکر۔ اور خدمتِ خلق، کو اسلامی خطوط کے مطابق منظم کرنے۔ ان میں باہمی ربط و ضبط پیدا کرنے اور انہیں مؤثر اور با قوت بنانے کے لئے مناسب اقدامات کرے)۔

اس سفارش کا تجزیہ کرنے سے پہلے ذرا یہ دیکھئے کہ اسلام کہتے کسے ہیں اور اس کے ان ارکان کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔

قرآن کریم نے بالفاظ صریح بتایا ہے کہ ایمان و اعمالِ صالح کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض — دنیا میں حکومت — ہے (۲۴/۵۵)

حضور نبی اکرم کی قیادت میں جماعتِ مومنین کے ایمان و اعمال صالح کے نتیجہ میں، خدا کے اس وعدہ (ابدی قانون) کی رُو سے، ایک حکومت قائم ہوئی۔ اس حکومت کی خصوصیات (یا فرائض حیات) کی قرآن کریم نے ان الفاظ میں تصریح کر دی۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگیا تو یہ نظام صلوٰۃ قائم کریں گے۔ ایتائے زکوٰۃ کا انتظام کریں گے۔ معروف کا حکم دیں گے۔ منکر سے روکیں گے۔ اور ان کا ہر معاملہ آخر الامر خدا کی طرف لوٹے گا۔

یہ اسلامی حکومت کے فرائض بتائے گئے ہیں۔ فرائض ہی نہیں بلکہ یوں کہئے کہ اسلامی حکومت کے قیام کی وجہ جواز ہی یہ امور ہیں۔ بالفاظ دیگر اگر اسلامی حکومت قائم نہ ہو تو یہ امور سرانجام ہی نہیں پا سکتے اور اسلامی حکومت قائم ہی اس لئے کی جاتی ہے (یہ وجود میں آتی ہی اس لئے ہے) کہ وہ ان امور کو سرانجام دے۔ نبی اکرمؐ کے عہد ہمایوں اور خلافت راشدہ میں یہ امور حکومت کی طرف سے سرانجام پاتے تھے۔ اس کی طرف سے جو قانون نافذ یا حکم صادر ہوتا تھا جس میں کچھ کرنے کی تاکید ہوتی تھی، اس کا نام امر بالمعروف تھا۔ جس میں کسی بات سے روکا جاتا تھا، اُسے نہی عن المنکر کیا جاتا تھا۔ حکومت کی آمدنی (جس سے وہ افراد انسانیہ کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتی تھی) زکوٰۃ تھی۔ اس زمانے کے سیدھے سادے مالیاتی حساب کتاب کے نظام کا نام بیت المال تھا۔ اور پورے معاشرہ کے نظم و نسق کو جو وحی کی مستقل اقدار کے پیکر میں ڈھلا ہوا تھا، نظام صلوٰۃ سے تعبیر کیا جاتا تھا جس میں وقتی اجتماعات بھی شامل تھے۔

تقسیم کار کے ماتحت، مختلف امور مملکت کا مختلف شعبوں میں بانٹ دیا جانا اور بات تھی، لیکن اس حکومت میں یہ نقشہ قطعاً نہیں تھا کہ "امور مذہبیہ" کے لئے نظام حکومت میں الگ شعبہ قائم ہو جس کے ذمے نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض ہوں جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ کا قیام و استحکام اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر تو اسلامی حکومت کے قیام اور وجود کی اصل و اساس تھی۔

خلافت راشدہ کے بعد جب نظام حکومت بدلا ہے تو اس کا نقشہ کچھ اور ہو گیا۔ اس میں دین ـــ جو اسلامی نظام حکومت ہی کا دوسرا نام تھا ـــ دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک حصہ امور دنیا سے متعلق جسے حکمرانوں نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور دوسرا حصہ امور شریعت سے متعلق جسے مذہبی پیشوائیت کو تفویض کر دیا گیا۔ اسلامی حکومت کے وہ ارکان جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، امور شریعت کے تابع آ گئے۔ اب ظاہر ہے کہ جب ان ارکان کا تعلق امور دنیا سے نہ رہا تو ان کا مفہوم بھی بدل گیا۔ اب نظام صلوٰۃ کے معنی ہو گئے پنج وقتہ نماز۔ زکوٰۃ سے مفہوم ہو گیا وہ اڑھائی فیصد جو خدا کا حصہ تصور کر لیا گیا۔ یعنی حکومت کا اپنا ٹیکس الگ اور خدا کا حصہ الگ۔ جہاں یہ روپیہ جمع ہوا اسے بیت المال کہا گیا جس کا حساب کتاب، حکومت کی آمد و خرچ سے الگ رکھا گیا۔ اب امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے معنی ہو گئے علماء کرام اور واعظین عظام کی طرف سے وعظ و نصیحت۔ اور خدمت خلق سے مفہوم ہو گیا عام "ثواب کے کام" ـــ لوگوں سے انفرادی ہمدردی۔ صدقہ خیرات سے محتاجوں کی امداد۔ دینی مدرسوں کا قیام۔ علاج معالجہ کے سلسلہ میں لوگوں کی مدد۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستان میں انگریزوں کے عہد حکومت تک یہی نقشہ قائم تھا۔ اس حکومت میں مسلمانوں کو ان تمام امور کی آزادی تھی ـــ نمازوں سے کوئی نہیں روکتا تھا۔ زکوٰۃ ادا کرنے اور اسے اپنے طور پر جمع کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وعظ و نصیحت کی اجازت تھی۔ خدمت خلق کو قابل ستائش سمجھا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے، حکومت اور مولوی صاحبان دونوں کے نزدیک مسلمانوں کو پوری پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ لیکن جن ارباب بصیرت کی نگاہیں دین پر تھیں وہ جانتے تھے کہ اسلام اس کا نام نہیں۔ اسلام ایک ایسے نظام حکومت کا متقاضی ہے جس میں "دنیا اور مذہب" کی ثنویت ختم ہو جائے اور یہ تمام امور جنہیں "مذہب کے اجزاء" سمجھا جاتا ہے خود حکومت کے فرائض بن جائیں۔ اس مقصد کے لئے ایک آزاد مملکت کا مطالبہ کیا گیا اور (بحمداللہ) پاکستان

وجود میں آگیا۔ ضرورت تھی کہ پاکستان میں حکومت کا پھر سے وہی نقشہ قائم کیا جائے جو عہد محمد رسول اللہ والذین معہ میں تھا ـــ یعنی خلافت علیٰ منہاج نبوت کا قیام۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت کے ذہن سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا تصور ہی محو ہو چکا تھا۔ اس کے نزدیک اسلامی نظام حکومت کا وہی نقشہ عین مطابق اسلام تھا جو ہمارے دور ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ ان حضرات کی مسلسل کوشش یہی چلی آ رہی تھی (اور اب تک ہے) کہ "مذہبی امور" حکومت کے دائرے سے الگ رہیں، اور ان پر ان کا قبضہ و تصرف ہو۔ مساجد کی تنظیم۔ زکوٰۃ کی وصولی اور اس کا مصرف۔ صدقہ خیرات، فطرانہ وغیرہ کی رقوم کا جمع اور خرچ کرنا (جسے ان کی اصطلاح میں بیت المال کہا جاتا ہے)۔ وعظ و نصیحت۔ جمعہ کے خطبات وغیرہ، سب ایک دائرہ میں محدود کر کے (اسے ادارہ امور مذہبیہ سے تعبیر کیا جائے) اور اس ادارہ کے جملہ حقوق مذہبی پیشوائیت کے نام محفوظ رہیں۔ حکومت ان میں کوئی دخل نہ دے۔ اسی طرح پرسنل لاز بھی پبلک لاز سے الگ رکھے جائیں اور اول الذکر مذہبی پیشوائیت کے زیر اقتدار رہیں۔ یوں ریاست کے اندر ایک الگ ریاست (State within State) قائم کر کے، مملکت میں دو متوازی حکومتیں قائم کر دی جائیں۔

اس پس منظر میں آپ اسلامی مشاورتی کونسل کی سفارش کا جائزہ لیجئے۔ بات نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ان حضرات کے ذہن میں بھی دین کا تصور نہیں۔ اسی اسلام کا تصور رہے جو ہمارے عہد ملوکیت میں وضع ہوا تھا (اور جسے مٹانے کے لئے پاکستان کی الگ مملکت قائم کی گئی تھی۔ لیکن چونکہ مذہبی پیشوائیت کا مفاد اسی میں ہے کہ ریاست کے اندر ان کی اپنی جداگانہ ریاست قائم ہو، اس لئے وہ ہر اس آواز کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں جو اس ثنویت کو مٹا کر دین کا صحیح نظام قائم کرنے کی دعوت دے۔ طلوع اسلام کا یہی جرم ہے جس کی پاداش میں اسے مختلف "القاب" سے نوازا اور کفر و الحاد کے فتاویٰ کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ ان حضرات کی اس ستم ظریفی پر غور کیجئے کہ جو خلافت علیٰ منہاج نبوت کے احیاء کی دعوت دے وہ ان کے نزدیک منکر شان رسالت، منکر حدیث، اور کافر و ملحد اور جو اس "اسلام" کے برقرار رکھنے پر مصر ہوں جو ہمارے دور ملوکیت کی پیداوار ہے، وہ محافظ دین متین قرار پائیں!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد

اب آپ اندازہ فرمالیجئے کہ اسلامی مشاورتی کونسل کی یہ سفارش اسلامی نقطۂ نگاہ سے کیسی ہے،

اس سے ظاہر ہے کہ (۱) یا تو یہ حضرات جانتے ہی نہیں کہ دین کی رو سے حکومت کا نظام کس قسم کا ہوتا ہے۔ اور اگر یہ جانتے ہیں تو (۲) پھر یہ حضرات دانستہ مداہنت برت رہے ہیں تاکہ علماء حضرات کی طرف سے ہدفِ ملامت نہ بنیں۔ دونوں صورتوں میں ان کی یہ سفارش نہایت تاسف انگیز ہے۔ اگر انہی لوگوں کے مشورہ کے مطابق یہاں اسلام کا احیاء ہوتا ہے، تو اس اسلام بیچارے کی قسمت پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے!

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں یار ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا۔ کوئی غمگسار ہوتا

جس کونسل کا دین کے متعلق وہ تصور ہو جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، اس کی طرف سے جو دیگر سفارشات ہوئی ہونگی ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ـــــ قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا۔ بہرحال وہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

دوسری سفارش میں صدر مملکت سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ سرکاری تقریبات کے موقع پر شراب پیش کرنے کی ممانعت کردیں۔ افطار اور نمازوں کے اوقات میں، تقریبات منعقد نہ کی جائیں نہ ہی اجلاس رکھے جائیں۔ اور رمضان کے مہینے میں، لنچ اور عصرانہ کی چائے وغیرہ کی بندش کر دی جائے۔

آپ غور فرمائیے کہ اس سفارش کیلئے حکومت کو ایک مشاورتی کونسل متعین کرنی پڑی ہے جس پر بقدر زرِ کثیر صرف ہوتا ہے۔ کیا اس سفارش میں اور ایک عام دیہاتی مولوی کے وعظ میں کوئی فرق ہے؟

تیسری سفارش میں کہا گیا ہے کہ سینما کے فلموں۔ ہوٹلوں کے پروگراموں اور ہمارے لٹریچر میں فحاشی عام ہو رہی ہے۔ اس کی روک تھام کی تدبیر کی جائے۔ بالخصوص فلموں پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔

چوتھی سفارش میں سابقہ سفارش کی مزید تصریحات ہیں۔

پانچویں سفارش میں کہا گیا ہے کہ اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں۔

چھٹی سفارش میں، بچوں کو اغواء کرنے والوں کے لئے سات سال کی قید تجویز کی گئی ہے۔

اور ساتویں میں سمگل کرنے والوں کے لئے سخت سزا۔

آٹھویں سفارش میں کہا گیا ہے کہ جو مذہبی لٹریچر باہر سے درآمد کیا جاتا ہے اس کی چھان پھٹک کے لئے سنسر بورڈ مقرر کئے جائیں۔

نویں سفارش میں اسے پھر دھرایا گیا ہے کہ لٹریچر، سینما کی فلموں۔ اشتہارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں، فحاشی کی روک تھام کے لئے مرکز اور صوبوں میں یکساں پالیسی وضع کرنی چاہیئے۔

اور دسویں سفارش میں کہا گیا ہے کہ حکومت جو پبلک اسکول قائم کرنا چاہتی ہے، ان میں وہ سب مفید باتیں ہونی چاہئیں جو مغرب کے پبلک اسکولوں میں ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ ہی اخلاقی طور پر ایسی تعلیم دی جائے جو آنے والی نسلوں کو قوم کی آئیڈیالوجی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل بنا دے ۔ و تلک عشرۃ کاملۃ ۔

یہ ہیں وہ سفارشات جن کا قوم تین سال سے اس شدت سے انتظار کر رہی تھی اور جنہیں یہ کہکر پیش کیا گیا ہے کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے یہ مملکت صحیح معنوں میں اسلامی ہو جائے گی اور اہل پاکستان، سچے اور پکے مسلمان بن جائیں گے۔ ان سے وہ مقصد حاصل ہو جائے گا جس کے لئے پاکستان مانگا اور حاصل کیا گیا تھا، اور اس طرح اقوام عالم کی امامت کبریٰ اس کے حصے میں آجائیگی! یا للعجب ۔

حافظ نے کہا تھا ۔ کہ عشق آساں نمود اول، ولے افتاد مشکل ہا ۔ ہمارے ساتھ یہی ہوا ہے۔ پاکستان حاصل کرنے کی جنگ دس برس سے بھی کم عرصہ میں ختم ہو گئی تھی لیکن اس کے بعد اٹھارہ برس ہونے کو آئے، یہی طے نہیں پا رہا کہ ہم نے پاکستان حاصل کس لئے کیا تھا؟ یہ ہر شخص کی زبان پر ہے کہ پاکستان، اسلام کے لئے حاصل کیا گیا تھا لیکن خود اسلام کیا ہے اس کا متعین تصور کسی کے ذہن میں نہیں۔ اس قسم کی آوازیں ہر طرف سے سنائی دیں گی کہ "اسلام نوع انسان کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے" یا یہ کہ "اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو ہماری تمدنی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، اقتصادی، قومی، بین الاقوامی، ادبی، ثقافتی، انفرادی، اجتماعی، غرضیکہ زندگی کے ہر گوشے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے" لیکن جب کسی سے پوچھئے کہ ذرا اس راہ نمائی کی تفصیل تو بتا دیجئے، بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیں گی۔ ماڈرن طبقہ تو اس اجمال کی تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھیگا۔ اور قدامت پرست طبقہ کی تان ٹوٹے گی تو اس پر کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیجئے۔ زانی کو سنگسار کر دیجئے۔ شراب کی ممانعت کر دیجئے۔ فحش لٹریچر اور فلموں پر پابندی لگا دیجئے۔ چار بیویاں کرنے کی چھٹی دید یجئے۔ بس اتنا کر دیجئے تو اسلام کا منشاء پورا ہو جائے گا۔ یعنی یہ کر دیجئے تو نہ صرف آپ کی، بلکہ نوع انسان کی تمام مشکلات کا حل مل جائے گا۔

حضرت لوطؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا ۔ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ (۱۱/۷۸) کیا تم میں کوئی ایک بھی رجل رشید نہیں ؟ ہمیں افسوس سے یہی الفاظ یہاں دہرانے پڑتے ہیں کہ کیا ہمارے معاشرہ میں کوئی ایک بھی رجل رشید ایسا نہیں جو یہ کہے کہ بالآخر اسلام کے ساتھ یہ کھیل کیوں کھیلا جا رہا ہے ؟ اگر آپ اس باب میں واقعی سنجیدہ (Serious) ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام زندگی کا قیام ہو، تو پھر اس نظام کے خدوخال متعین کیجئے۔ یہ طے کیجئے کہ اسلام کی رُو سے ہماری سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی زندگی کا نقشہ کیسا ہونا چاہیئے۔ یہاں قانون سازی کا اصول کیا ہوگا، حکومت کے حقوق و واجبات کیا ہونگے اور فرائض اور ذمہ داریاں کیا۔ افراد معاشرہ کے بنیادی حقوق کیا ہونگے اور ان کے حصول کی صورت کیا۔ ہمارا معاشیات کا ڈھانچہ (PATTERN) کس قسم کا ہوگا اور اس کا مقصود و منتہیٰ کیا۔ ہماری معاشرتی اور عائلی زندگی کا نقشہ کیسا ہوگا اور اس کے حدود و قیود کیا ؛ ہمارا ثقافتی منہاج و مسلک کیا ہوگا اور اس کی آزادی اور پابندی کی حدود کیا ؛ یعنی جب آپ کا دعوےٰ ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے تو اسے ایک نظام کی حیثیت سے سامنے لائیے اور پھر موجودہ نظام کو اس کے مطابق بنانے کے لئے عملی اقدامات کیجئے۔

لیکن اسے اچھی طرح سمجھ رکھئے کہ (جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں) اسلام کو بہ حیثیت ایک دین (نظام حیات) کے سمجھنا اور پیش کرنا ہمارے علماء حضرات کے بس کی بات نہیں۔ اس سے کسی کی تنقیص و تنکیر مقصود نہیں۔ ان حضرات کے نصاب تعلیم کو آپ اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں اسلام کے ایک نظام زندگی ہونے کا کہیں ذکر تک نہیں ملیگا۔ ان کے نصاب میں وہی اسلام سامنے آئے گا جو ہمارے دور ملوکیت میں وضع ہوا تھا اور جس کی حیثیت صرف "مذہب" کی رہ گئی تھی۔ دین کی نہیں رہی تھی۔ لہٰذا یہ حضرات اس باب میں معذور ہیں۔ اسلام کو بہ حیثیت دین (نظام زندگی) کے وہی سمجھ سکیں گے جو قرآن کریم کا براہ راست (خالی الذہن ہوکر) مطالعہ کریں اور اس کے بعد ہر اس چیز کا جسے اس ہزار سال میں اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا رہا ہے (اور پیش کیا جاتا ہے) قرآن کریم کی روشنی میں جائزہ لیں۔ جو چیز قرآن کریم کے پیش فرمودہ تصور دین کے مطابق ہو، اسے قابل قبول سمجھیں۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیں۔ اس طرح دین کا صحیح تصور متعین ہو سکے گا۔

یاد رکھئے۔ یہاں فیصلہ طلب سوال یہ نہیں کہ شراب ممنوع ہے یا نہیں، یا فحش لٹریچر کی اشاعت

اچھی چیز ہے یا بری۔ شراب کے ممنوع اور فحاشی کے معیوب ہونے میں دو آراء ہو نہیں سکتیں۔ حتیٰ کہ جو مسلمان (بدقسمتی سے) شراب پیتے ہیں وہ بھی اسے ممنوع سمجھتے ہیں اور آوارہ سے آوارہ نوجوان سے بھی پوچھئے تو وہ کبھی نہیں کہے گا کہ فحاشی اچھی چیز ہے۔ اصل غور طلب سوال یہ ہے کہ ممنوع سمجھنے کے باوجود مسلمان شراب کیوں پیتے ہیں اور پینے والے اسے کیوں نہیں چھوڑتے۔ یہی سوال دوسرے معائب کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ مشاورتی کونسل کے سوچنے کا کام یہ تھا کہ وہ حکومت کو بتاتی کہ مسلمانوں میں یہ خرابیاں عام کیوں ہو رہی ہیں اور ان کے مداوا کی صورت کیا ہے۔ نہ یہ کہ شراب ممنوع ہے اس لئے حکومت کو چاہیئے کہ اسے بند کردیں۔ کیا مشاورتی کونسل کے نزدیک، ہمارے اربابِ حکومت (جو خدا کے فضل سے ارکانِ کونسل کی طرح مسلمان ہیں) ایسے ہی گئے گذرے ہیں کہ انہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اسلام میں شراب ممنوع ہے یا نہیں، مشاورتی کونسل کے مشورے اور سفارش کی ضرورت تھی! انہیں یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ معاشرہ کی ان خرابیوں کی علت کیا ہے اور اس کا مؤثر علاج کیا! اس لئے کہ یہ سوال واقعی تحقیق طلب ہے اور اسی مقصد کے لئے مشاورتی کونسل کا انعقاد عمل میں لایا گیا تھا۔ ورنہ شراب کی ممانعت کے متعلق تو دو پیسے کی "پکی روٹی"[1] سے بھی معلوم ہو سکتا تھا۔

لیکن یہاں پھر وہی دشواری سامنے آتی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہ تمام خرابیاں پیدا کردہ ہیں ہمارے غلط معاشرتی، معاشی اور تعلیمی نظام کی۔ اور جب تک ان نظاموں میں ہماری مملکت میں (قرآنی خطوط کے مطابق) تبدیلی نہ کی جائے، ان خرابیوں کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ جس درخت کی جڑ کھوکھلی ہو چکی ہو اس کے پتوں پر پانی چھڑکنے سے وہ ہرا بھرا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اسلامی نظام کا تصور ان حضرات کے بس کی بات نہیں۔ یا تو وہ ان کے ذہن میں ہی نہیں آسکتا۔ اور اگر ان میں ایسے حضرات موجود ہیں جو ان خطوط پر سوچ سکتے ہیں تو وہ قدامت پرست مذہبی پیشوائیت کے "تکفیری پراپیگنڈہ سے ڈر کر جرأتِ لب کشائی نہیں کر سکتے"۔ وجہ کوئی بھی ہو، یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ موجودہ منہاج اور طریق کار اساسی طور پر غلط ہے اور اس سے کبھی کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ حکومت کے لئے معلوم کرنے کی بات یہ ہے کہ قرآن کا سیاسی نظام کیا ہے۔ قرآن کا معاشی نظام کیا ہے۔ اس کی رُو سے زندگی کا صحیح قالب، Pattern کونسا ہے۔ یہ قالب کس قسم کی تعلیم و تربیت سے تیار ہو سکتا ہے۔

لیکن اس کے لئے ایک آہن گداز نگاہ، اور خارا شگاف عزم کی ضرورت ہے۔ اور

تو توقع نہ بگل کوزہ گراں می داری!

---

[1] پنجابی زبان میں ابتدائی مسائل سے متعلق ایک مختصر سی کتاب کا نام

جُرم اور سزا

(قرآنک اسٹڈی سرکل میں ایک سوال کا جواب)

قرآن کریم میں دو قسم کے احکام ملیں گے ــــ ایک عام اخلاقی اور دوسرے تعزیری۔ تعزیری سے مراد ہیں ایسے احکام جسے سوسائٹی کا جرم قرار دیا جائے۔ اور اخلاقی احکام سے ایسے احکام مراد ہیں جن کی خلاف ورزی معاشرتی جُرم قرار نہ پائے۔ مثلاً لاتمش فی الارض مرحًا (۱۷/۳۷)۔ (زمین میں اکڑ کر نہ چلو) قرآن کا حکم ہے۔ لیکن یہ ایسا حکم نہیں جس کی خلاف ورزی معاشرہ کا جُرم قرار دیا جائے۔ اسی سورۃ میں دوسرا حکم ہے۔ لا تقربوا الزنیٰ (۱۷/۳۲) (زنا کے قریب مت جاؤ) ظاہر ہے کہ اس حکم کی خلاف ورزی معاشرتی جُرم ہو گی۔

واضح رہے کہ احکام کی اخلاقی اور تعزیری تقسیم محض زیرِ نظر سوال کے سمجھنے کے لئے کی گئی ہے۔ ورنہ قرآن کریم کے ہر حکم کی بنیاد اصلاحِ اخلاق ہے۔ اور اخلاق سے مراد ہے انسانی ذات کی نشو و نما کے ذرائع۔

تعزیری احکام بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کی سزا بھی قرآن نے خود ہی تجویز کر دی ہے (مثلاً زنا) اور دوسرے وہ جن کی سزا اس نے خود تجویز نہیں کی بلکہ اسے اسلامی نظام پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ، حالات کے مطابق ان کی سزا خود متعین کرے۔ (مثلاً اس نے الخمر کے استعمال سے منع کیا ہے لیکن اس حکم کی خلاف ورزی کی سزا تجویز نہیں کی)

یہ مسئلہ بڑا غور طلب ہے کہ قرآن کریم نے جن احکام کی سزا خود تجویز نہیں کی، ان میں سے کون کون سے ایسے ہیں جنھیں تعزیری احکام کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب کوئی ایک فرد نہیں دے سکتا نہ ہی کسی فرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی حکم کی خلاف ورزی کو معاشرتی جُرم قرار دے کر اسے مستوجب سزا ٹھہرائے یہ فیصلہ اسلامی نظام کے کرنے کا ہے۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ جو فیصلے اسلامی نظام کریگا ان میں وقتاً فوقتاً۔ (بہ تقاضائے حکمت) تبدیلیاں ہوتی رہیں گی)

احکام ہی نہیں۔ قرآنِ کریم نے جن امور کو بطور اصول بیان کیا ہے۔ یا جو حدود مقرر کی ہیں، ان کی خلاف ورزی کی مخصوص شکلوں کو جُرم قرار دینا بھی اسلامی نظام کا فریضہ ہے (حدود کا لفظ میں نے فقہی اصطلاح ــ حد ــ کے معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ اس سے مراد ہے اعمال کا وہ دائرہ جس کے اندر رہنے کی آزادی ہے لیکن جس سے تجاوز کرنا

منع ہے۔ حدود اور اصول ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

۳۔ اسلامی نظام کا فریضہ یہ ہے کہ وہ معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کرے جس میں سانس لینے والا ہر فرد ——— اپنے ہر بنیادی حق اپنی ہر متاع زیست کو اس طرح محفوظ سمجھے کہ اسے اس باب میں ذرا سا تردد، فکر یا تشویش نہ ہو۔ اسے اس کے متعلق پورا پورا اطمینان اور یقین حاصل ہو۔ قرآنی نظام کا لازمی نتیجہ اس قسم کی فضا کا وجود میں لانا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نظام میں افراد معاشرہ کی خصوصیت یہ ہوگی کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۲۷۷) وہ اس فضا کو قرآنی اقدار سے متعلق تعلیم و تربیت اور افراد معاشرہ کو بنیادی ضروریات زندگی کی طرف سے بے فکر کر دینے سے پیدا کرتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود معاشرہ میں بعض افراد ایسے ہو سکتے ہیں جو "نفسیاتی مریض" ہوں اور ان کا "پاگل پن" افراد معاشرہ سے امن و اطمینان کا احساس چھین لے۔ ایسے مریضوں کا علاج ضروری ہے۔ اور جب تک وہ پورے طور پر شفایاب نہ ہوں افراد معاشرہ کو ان کے جنون کے پیدا کردہ خطرات سے محفوظ رکھنا ازبس لازمی ہے یہ علاج اکثر و بیشتر ان مریضوں (مجرموں) کی قلبی اور ذہنی اصلاح سے ہو جاتا ہے لیکن بعض اوقات اس کے لئے بطور آخری اقدام تخویف و ترہیب کی بھی ضرورت پیش آتی ہے ——— کئی نفسیاتی امراض ایسے ہیں جن کا علاج خوف کی احساس دہی سے کیا جاتا ہے ——— اس طریق علاج کو سزا کہا جاتا ہے۔ اس سے مقصد کبھی خود اس مجرم کی اپنی اصلاح ہوتی ہے۔ اور کبھی ان کی اصلاح جن کے تحت الشعور میں ارتکاب جرم کے جراثیم پرورش پا رہے ہوں، سزا بطور انتقام کا تصور غیر قرآنی ہے۔

یہ تو رہا سزا کا ایک مقصد۔ اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ مجرم نے جس شخص کو نقصان پہنچایا ہے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے۔ مثلاً ایک شخص نے کسی کے ہاں چوری کی ہے۔ اگر عدالت نے اس مجرم کو دس سال قید کی بھی سزا دیدی تو اس سے اس مظلوم کے نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ عدل کا تقاضہ یہ ہے کہ اس شخص کا نقصان پورا کیا جائے اگر مال مسروقہ برآمد ہو گیا ہے تو اسے واپس دلایا جائے۔ اگر وہ برآمد نہیں ہوا تو نظام معاشرہ اسے خود مہیا کرے یا اس کی قیمت ادا کرے۔ قرآنی تصور "جرم و سزا" کی رو سے مستغیث۔ مجرم کے خلاف مدعی نہیں ہوتا وہ نظام معاشرہ کے خلاف مدعی ہوتا ہے۔ معاشرہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی ہر متاع کی حفاظت کرے گا۔ اگر اس پر کسی نے ہاتھ ڈال دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نظام معاشرہ نے اس شخص سے وعدہ خلافی کی ہے، اس لئے اس شخص کے نزدیک "مجرم" نظام معاشرہ ہے نہ کہ وہ خاص فرد جس نے ارتکاب جرم کیا ہے۔ یہ نظام معاشرہ کے دیکھنے کی چیز ہے کہ وہ اس نقصان کو مجرم سے پورا کراتا ہے یا خود پورا کرتا ہے۔ مظلوم کو اس سے واسطہ نہیں۔ نظام معاشرہ کا فریضہ مظلوم یا اس کے وارثوں کا پشت پناہ بننا اور ان کی مدد کرنا ہے۔ فَقَدْ جَعَلْنَا

لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا ...... اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (۱۷/۳۳) اگر نظامِ معاشرہ مظلوم کے نقصان کی تلافی نہیں کرتا، تو وہ اس کا پشت پناہ کیسے بن سکتا ہے، اور حامی و ناصر ہونے کا دعوےٰ کس طرح کر سکتا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہر نقصان کی تلافی روپے سے نہیں ہو سکتی۔ لیکن نظامِ معاشرہ کو بہر حال اس کی تلافی کی شکل پیدا کرنی ہو گی۔ اس کی تلافی کرنی ہو گی اور اس کا انتظام کرنا ہو گا کہ آئندہ معاشرہ میں ایسا نہ ہو۔

۴۔ اوپر کہا گیا ہے کہ تعزیری نظم و نسق سے مقصود یہ ہے کہ ارتکابِ جرم کے نفسیاتی مریضوں کا علاج ہو جائے۔ نفسیاتی علاج کی کامیابی کی اولین شرط یہ ہے کہ مریض کو مرض کا احساس ہو جائے یعنی مجرم دل سے اعتراف کرے کہ اس نے غلطی کی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر مجرم کے دل میں فی الواقعہ یہ احساسِ ندامت پیدا ہو جائے تو اس کی اصلاح کی امید ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ "سزا دینے" کے بجائے معاف کر دیتا ہے اور پھر اس پر نگاہ رکھتا ہے کہ وہ اپنی اصلاح کرے اور ایسا کرنے میں وہ اس کی ہر ممکن مدد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سزا سے پہلے عفو و درگزر کرکے اصلاح کرنے، کی گنجائش رکھی ہے۔ وہ سزا اس صورت میں تجویز کرتا ہے جب مجرم میں ویسے اصلاح کا امکان نہ ہو۔

۵۔ قرآن، بدنی سزائیں (CORPORAL PUNISHMENTS) تجویز کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ چور کو جیل خانے بھیج دے جہاں اسے روٹی کپڑا ملتا رہے اور اس کے بیوی بچے بھوکوں مر جائیں۔ یعنی جرم وہ کرے اور سزا یہ بے گناہ بھگتیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ خوف جس سے عادی مجرموں کی اصلاح کا امکان ہو سکتا ہے۔ یا جس سے امکانی مجرموں کو ارتکابِ جرم سے باز رکھا جا سکتا ہے بدنی سزا سے پیدا ہو سکتا ہے۔

۶۔ اب ان اصولوں کو دیکھئے جنہیں قرآن اس باب میں بنیادی قرار دیتا ہے۔

۱۔ قصاص۔ اس کے معنی جرم کی سزا دینا نہیں۔ اس کے معنی ہیں مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ وہ بلا گرفت نہ رہ جائے۔ یعنی قرآنی نظام میں کسی جرم کو (UN-TRACED) نہیں رہنا چاہئے۔ وہ اس قسم کے محکم نظامِ تفتیش میں حیاتِ اجتماعیہ کا راز بتاتا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ (۲/۱۷۹)

۲۔ عدل۔ یعنی فیصلہ کرتے وقت مجرم کی معاشرہ میں پوزیشن، عدل کے تقاضے پر کسی طرح اثر انداز نہ ہونے پائے۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (۲/۱۷۹)

۳۔ جرم کی سزا، جرم کی نوعیت کے مطابق ہونی چاہئے۔ اس سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۴۲/۴۰) یہ بھی اس صورت میں جب ویسے اصلاح کا امکان نظر نہ آئے۔

۴۔ جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے ملزم کو بے گناہ سمجھنا چاہئے۔ اور معاشرہ کو اس کے متعلق حسنِ ظن سے کام لینا چاہئے۔ سورۂ نور میں ہے کہ مدینہ میں بعض لوگوں نے کسی کے خلاف تہمت تراشی اور لوگ اسے لے اُڑے

اس پر قرآن کریم نے یہ ہدایت دی کہ تم نے جب یہ افواہ سنی تھی تو تمہارا ردِ عمل یہ ہونا چاہیے تھا کہ ھٰذَا اِفْکٌ مُّبِیْنٌ وبہتان عظیم (۲۴/۱۲، ۱۳) یہ ایک مستقل راہ نمائی ہے کہ ملزم کے متعلق سوء ظن سے کام نہیں لینا چاہیئے

۵۔ کسی قانون کے نافذ ہونے سے پہلے اگر کوئی کام ایسا ہو گیا ہو جو اس قانون کے خلاف ہو ——————

—— تو اسے جرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بالفاظ دیگر کسی قانون کا اطلاق کسی سابقہ تاریخ سے نہیں ہو سکتا اس کا اطلاق اس کے نفاذ کے بعد سے ہو گا۔ قرآن کریم میں کئی ایک احکام کے سلسلہ میں کہا گیا ہے۔ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (۴/۲۲) جو اس سے پہلے ہو گیا اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

۶۔ جس فعل کے ارتکاب میں دل کا ارادہ شامل نہ ہو اس پر مواخذہ نہیں ہو گا۔ سورۃ احزاب میں ہے لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ فِیْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ۔ وَلٰکِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُکُمْ (۳۳/۵) جو کچھ تم سے سہواً ہو جائے اس پر مواخذہ نہیں۔ مواخذہ اس پر ہے جس میں تمہارے دل کا ارادہ شامل ہو۔

لیکن لاپرواہی ایک الگ جرم ہے اور قابل سرزنش۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے قتل خطا کی سزا بھی تجویز کی ہے اگرچہ وہ سزا جرم قتل کی نہیں بطور کفارہ کے ہے (۴/۹۲)

۷۔ بڑے بڑے جرائم سے بچنے والے سے اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو جائے تو وہ قابل معافی ہوتی ہے۔ سورۃ النجم میں ہے اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳/۳۲) جو لوگ بڑے بڑے جرائم سے بچتے ہیں ان سے اگر کبھی کوئی معمولی سی لغزش ہو جائے تو قابل عفو ہے۔

۸۔ سزا تجویز کرتے وقت مجرم کی ذہنی سطح، تعلیم و تربیت اور ماحول کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی بنا پر قرآن نے (اس زمانے کی) لونڈیوں کے جرم زنا کی سزا شریف عورتوں سے نصف قرار دی ہے (۴/۲۵) کیونکہ جس ماحول میں وہ پرورش پاتی تھیں اس کے پیش نظر ان سے بلند اخلاق کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اس کے برعکس رسول اللہ کے گھرانے کی عورتوں سے کہا گیا کہ اگر ان سے کوئی جرم سرزد ہوا تو اس کی دگنی سزا ہو گی۔ (۳۳/۳۰)

۹۔ قرآن جس قسم کا معاشرہ قائم کرتا ہے اور اس میں افراد معاشرہ کی تربیت جس انداز سے کرتا ہے اس سے وہ توقع رکھتا ہے کہ اگر کسی سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے گی تو وہ خود اس کا اعتراف کرے گا اور صحیح صحیح بات کہہ دے گا، خواہ وہ اس کے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ (۴/۱۳۵) اس آیۂ جلیلہ میں قرآن کریم نے شہادت کے سلسلے میں ایسا بلند اصول پیش کیا ہے جس کی موجودگی میں عدل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی (اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں)

۱۰۔ قرآن کے پیش نظر مجرم کی اصلاح ہے، اس لئے وہ اس کے دل میں جرم کے مذموم ہونے کا احساس بیدار کرنے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک عجیب و غریب اصول پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (۴/۱۱۱) جو کسی کے خلاف ظلم و زیادتی کرتا ہے وہ بزعم خویش سمجھتا ہے کہ اس نے اس سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچایا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ جرم خود اپنی ذات کے خلاف کرتا ہے۔ اور اس کا نقصان خود اس کی ذات کو ہوتا ہے۔ اس میں صرف وحدتِ انسانیت کا بلند اصول ہی نہیں بتایا گیا بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ جرم سے خود مجرم کی اپنی ذات پر ایسا نقصان رساں اثر پڑتا ہے جس کی تلافی کسی خارجی سزا سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اگر مجرم کسی ترکیب سے اپنے آپ کو سزا سے بچا لے تو بھی اس سے جو نقصان اس کی اپنی ذات کا ہوا ہے وہ اس سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات وہ ہے۔ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹) جو نگاہ کی خیانتوں اور دل کے پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہے۔ یہ ہے وہ تعلیم جس سے وہ مجرم کے دل میں احساسِ ندامت بیدار کرتا ہے۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو اسے سزا دینے کے بجائے اصلاح کے مواقع فراہم کرتا ہے

اب ان جرائم کو لیجئے جن کی سزا قرآن کریم نے خود تجویز کی ہے۔ معاشرہ میں چار بنیادی چیزیں ہیں جن کی حفاظت ضروری ہے۔ جان، مال، عصمت اور نظامِ معاشرہ۔ قرآن کریم نے ان ہی میں خلل اندازی کو بنیادی جرائم قرار دیا ہے۔ یعنی قتل۔ سرقہ، فواحش اور بغاوت (مع ان کے تضمنات کے) اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے جو سزائیں تجویز کی ہیں وہ انتہائی سزائیں (EXTREME PENALTIES) ہیں۔ جن میں حالات کے مطابق تخفیف ہو سکتی ہے۔

(۱) جرم قتل

قرآن نے قتل عمد (۴/۹۲) اور قتل خطا (سہواً) میں فرق کیا ہے۔ قتل خطا کی سزا (یا یوں کہئے کہ کفارہ یا جرمانہ) ایک مومن غلام کا آزاد کرنا اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا ادا کرنا ہے۔ وہ اس خوں بہا کو معاف بھی کر سکتے ہیں (۴/۹۲) واضح رہے کہ غلام آزاد کرنا اس زمانے کی بات ہے جب عربوں کے ہاں غلام چلے آتے تھے۔ اسلام نے غلامی کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ لہٰذا اب نظامِ معاشرہ تجویز کرے گا کہ اس کی جگہ کیا کفارہ ادا کیا جائے گا۔

قتل عمد کے لئے دیت (خوں بہا) نہیں۔ اس کی سزا بڑی سخت ہے۔ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کی سزا جہنم ہے اور اللہ کا غضب اور اس کی لعنت اور بہت بڑی سزا (۴/۹۳) ہیں اس وقت ان مختلف سزاؤں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ قتل عمد کی بھی مختلف نوعتیں ہوتی ہیں۔ ایک قتل سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت ہوتا ہے ایک قتل جوش میں آکر وقتی طور پر (وغیرہ وغیرہ) اس اعتبار سے اس جرم کی سزا میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔ قرآن کے مختلف مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عدل کے تقاضے کی رو سے جرم قتلِ عمد کے لئے موت کی سزا بھی تجویز کرتا ہے

(مثلاً ۲/۱۷۸ و ۵/۴۵ و ۱۷/۳۳) "قتل نفس بالحق" سے مراد ہے قانونِ خداوندی کے مطابق کسی کی جان لینا۔

۲۔ **بغاوت**۔ اس کے لئے قرآن کریم نے "خدا اور رسول کے خلاف جنگ" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یعنی قرآنی نظامِ مملکت کے خلاف جنگ۔ اسے "فساد فی الارض" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی اس نظام کے خلاف کھلی ہوئی جنگ ہی نہیں بلکہ اسے درہم برہم کرنے اور ابتری پھیلانے کی کوشش کرنا۔ اس جرم کی سزا (۱) قتل کرنا (۲) صلیب دینا (۳) قطع ید و ارجل۔ یا (۴) جلاوطن کرنا دیا نظر بند کرنا ہے۔ عدالت حسبِ حالات جو سزا مناسب سمجھے عائد کرے۔

ان لوگوں سے دوستی رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہوں (۵۸/۲۲)۔ لیکن اسکی سزا قرآن نے تجویز نہیں کی۔

۳۔ حفاظتِ عصمت

عصمت کو قرآن بڑی اہمیت دیتا ہے اس لئے اس شعبہ کے مختلف گوشوں کو قرآن کریم سامنے لاکر، ان سے متعلق جرائم اور ان کی سزا بیان کرتا ہے۔ مثلاً۔

(۱) عام بے حیائی کی باتیں جنہیں اگر روکا نہ جائے تو وہ زنا تک پہنچانے کا موجب بن جائیں اس کے انسداد کے لئے کہا کہ ایسی عورتوں کو پابند مسکن کر دیا جائے۔ ان کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دی جائے۔ (۴/۱۵)۔ اس کے لئے چار گواہوں کی ضرورت ہوگی۔

۲۔ **زنا**۔ اس کی سزا عورت اور مرد دونوں کے لئے سو سو کوڑے ہیں۔ (۲۴/۲) ظاہر ہے کہ زنا بالجبر میں عورت مظلوم قرار پائے گی نہ کہ مجرم (اس لئے اسے سزا نہیں دی جائے گی) قرآن کریم نے نکاح کے علاوہ جنسی تعلق کی ہر صورت کو زنا قرار دیا ہے۔

جرم زنا میں لونڈیوں کی سزا شریف عورتوں سے نصف ہوگی۔ یعنی پچاس کوڑے۔ (سنگ ساری۔ رجم۔ کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں)

۳۔ شریف عورتوں کے خلاف تہمت تراشی کی سزا اسی کوڑے ہے (۲۴/۴) اس کے لئے چار گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ علاوہ بریں ایسے لوگوں کو شہادت کے لئے ساقط الاعتبار قرار دیا جائے گا (۲۴/۴) اگر تہمت تراشی کا معاملہ میاں بیوی میں ہو اور اس لئے گواہ نہ مل سکیں تو اس کے لئے "لعان" تجویز کیا گیا ہے۔ جس کی تفصیل ۲۴/۶-۹ میں دی گئی ہے۔

۴۔ شریف زادیوں کو چھیڑنا۔

قرآن کریم رو سے شریف زادیوں کو چھیڑنا۔ انہیں راستہ چلتے ہوئے تنگ کرنا، اذیت پہنچانا سنگین ترین جرم ہے۔ اس لئے کہ اس سے وہ احساس امن (SENSE OF SECURITY) ختم ہو جاتا ہے جس کا پیدا کرنا

اور قائم رکھنا اسلامی نظام معاشرہ کا بنیادی فریضہ ہے۔ قرآن نے اس کی روک تھام کے لئے تدریجی سزائیں تجویز کی ہیں۔ یعنی انہیں حقوق شہریت سے محروم کر دینا۔ انہیں شہر بدر کر دینا۔ جہاں ملیں گرفتار کر لینا۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو شدید طور پر قتل کر دینا۔ (۵/۳۳) اس لئے کہ یہ فساد فی الارض کی بدترین شکل ہے۔

۵۔ سرقہ

قرآن میں سارق عورت یا مرد کی سزا قطع ید آئی ہے (۵/۳۸)۔ قرآن نے السارق اور السارقۃ کہا ہے۔ یہاں "ال" کس بات کو متعین کرتا ہے ـــ یعنی سارق کسے کہتے ہیں اور سرقہ کی (DEFINITION) کیا ہے؟ اسے نظام اسلامی متعین کریگا۔ اسی طرح "قطع ید" کا مفہوم مجازی ہے یا حقیقی اس کا فیصلہ بھی وہی نظام کرے گا۔ اس سزا کا مقصد قرآن نے نکالاً من اللہ بتایا ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے انسداد جرم"۔ اور اس کے بعد "تاب واصلح" ـــ عفو و اصلاح کی گنجائش کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔

قرآن کریم میں انہی جرائم کی سزا کا تعین کیا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر کسی مجرم کو عدالت سے سزا مل جاتی ہے تو کیا وہ اس سے آخرت کے مواخذہ سے چھوٹ جاتا ہے؟ اس کے لئے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ آخرت کا مواخذہ کہتے کسے ہیں؟ انسان کے ہر عمل (حتیٰ کہ خیال تک) کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے اور انہی اثرات کے مجموعی نتیجہ کے مطابق اس کی اُخروی زندگی مرتب ہوتی ہے۔ مجرم کے جرم کا ایک اثر سوسائٹی پر پڑتا ہے اور دوسرا اثر خود اس کی اپنی ذات پر۔ عدالت کی طرف سے ملی ہوئی سزا سوسائٹی کے خلاف جرم کا تو ازالہ کر دیتی ہے لیکن اس جرم کا جو اثر مجرم کی ذات پر مرتب ہوا تھا اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔ اس کی تلافی اسے خود کرنی ہو گی۔ اس کے لئے احساس ندامت پہلا مرحلہ ہے جس کا نتیجہ توبہ ہوتا ہے۔ یعنی آئندہ کیلئے اس جرم سے محتاط رہنے کا تہیہ۔ اس کے بعد اصلاح کا مرحلہ آتا ہے یعنی ایسے تعمیری کام کرنا جن سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے جو اس جرم کے ارتکاب سے اس کی ذات کو پہنچا تھا۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱/۵) قرآن کے قانون مکافات کا بنیادی اصول ہے۔ یہ ہے وہ طریق جس سے مجرم "آخرت کے مواخذہ" سے بچ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کا خدا کے قانون مکافات عمل (آخرت) پر ایمان ہو اس سے جرم سرزد ہی بہت کم ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی مملکت کے فرماں روا

(خدا کے محکوم ——— دنیا کے حاکم)

پرویز

عید میلاد النبیؐ کی تقریب سعید (سنہ ۱۹۶۵ء) پر
وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ ہال۔ لاہور کے
جلسۂ عام سے خطاب

شائع کردہ ادارۂ طلوع اسلام لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اسلامی مملکت کے فرماں روا

کوثر چکد از لبم باز تشنہ لبی چنا درد مد از شبنم باز تیرہ شبی
اے دوست با ادب کہ در حریمِ دل ماست شاہنشۂ انبیاء - رسولِ عربی

برادرانِ گرامی قدر! سلام و رحمت -

جلسے اور اجتماعات اکثر منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ رسومات اور تقاریب ہمیشہ منائی جاتی ہیں۔ لیکن آج کا اجتماع اپنی نوعیت کا منفرد اجتماع اور آج کی تقریب اپنے انداز کی بے مثل تقریب ہے۔ یہ اجتماع وقف ہے نوعِ انسان کے اُس محسنِ اعظم کے تذکارِ جلیلہ کے لئے جس نے انسان کو دنیا میں انسان کی حیثیت سے رہنا سکھایا' اور یہ تقریب مختص ہے اُس زبدۂ شرفِ انسانیت کے ذکرِ جمیل کے لئے جس کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک نقش دلیلِ راہ اور نشانِ منزل ہے اُس کاروانِ شوق و مستی کے لئے جو زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے آمادۂ سفر ہو۔

وہ دانائے خلقتِ ہستی' وہ معنیٔ کونین۔ وہ جانِ حسنِ ازل - وہ بہارِ صبحِ وجود
وہ آفتابِ حرم' نازشِ گنجِ حرا - وہ دل کا نور' وہ اربابِ درد کا مقصود
وہ سرورِ دو جہاں' وہ محمدِ عربی - بصورتِ اعظم و بکشش درودِ لا محدود -

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ
وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا - (۳۳/۵۶)

عزیزانِ من! انسان مدنی الطبع (Social animal) واقع ہوا ہے اُس لئے اس نے لامحالہ مل جل کر رہنا ہے۔ مل جل کر رہنے کیلئے ضروری ہے کہ معاشرہ کے کچھ آئین و قوانین ہوں زندگی کیلئے

کچھ قواعد و ضوابط ہوں۔ باہمی معاملات کے لئے کچھ حدود و قیود ہوں۔ اسی کا

نظامِ حکومت

نام عام اصطلاح میں نظمِ معاشرہ یا نظامِ حکومت ہے۔ نظامِ حکومت انسان کی اجتماعی زندگی کی بنیادی ضرورت اور اولیں تقاضا ہے۔ لیکن انسانی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہ آج تک کوئی ایسا نظامِ حکومت وضع نہیں کر سکا جسے کامیاب کیا جا سکے۔ یہ اپنی تمدنی زندگی کی صبحِ اول سے اس نظام کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن آج تک اسے پا نہیں سکا۔ یہ ایک نظام وضع کرتا ہے اور اسے یہ کہکر اختیار کرتا ہے کہ یہ اس کی مشکلات کا حل پیش کر دے گا۔ لیکن تھوڑی دور چلنے کے بعد یہ دیکھتا ہے کہ اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو رہا جس کے لئے اسے وضع اور اختیار کیا گیا تھا۔ یہ اسے چھوڑ کر دوسرا نظام وضع اور اختیار کرتا ہے لیکن اس کا انجام بھی وہی ہوتا ہے۔ اور وہ ایک بار پھر با صد حسرت پکار اُٹھتا ہے کہ ـــــ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی ـــــ انسان کی ساری تاریخ اسی ساخت و شکست اور شکست و ساخت کی تاسف ناک اور کرب انگیز داستان ہے۔ اور اس کا سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

میں آج کی نشست میں آپ کے سامنے اس حقیقت کو پیش کرنا چاہتا ہوں کہ عالم انسانیت کے اس مشکل ترین مسئلہ کا حل وحیٔ خداوندی نے کیا پیش کیا اور حضور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور دست پروردگانِ رسالت (رضی اللہ تعالےٰ عنہم) نے اسے کس طرح عملاً متشکل کر کے دکھایا۔

قرآنی تصورِ حکومت

نظامِ حکومت کے دو شعبے ہیں۔ ایک انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے قوانین وضع کرنا ـــــ اسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں عملِ تقنین یا (Legislation) کہا جاتا ہے۔ اور دوسرا ان قوانین کو معاشرہ میں عملاً نافذ کرنا۔ اسے اجرائیہ یا (Executive) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بادنےٰ تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ حکومت کی اصل و بنیاد قانون سازی کا شعبہ ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کا اعلان کر دیا کہ حقِ حکومت (یعنی انسانوں کے لئے قوانین وضع کرنے کا حق) خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ـــــ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶/۵۷)۔ اس کے اس حقِ حکومت و اختیار میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶)۔ ان اصول و حدود کو اس نے اپنی کتاب (قرآن کریم) میں بیان کر دیا اور اس کا اعلان کر دیا کہ۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔ جو لوگ اس کتاب کے مطابق نظامِ حکومت قائم کریں گے وہ مومن ہیں۔ جو اس کے خلاف نظام متشکل کریں گے وہ کافر۔ جماعتِ مومنین وہ ہے جو دنیا میں قوانینِ خداوندی کو عملاً نافذ کرنے کی ذمہ دار ہے۔ یعنی جسے اسلامی حکومت کہا جاتا ہے اس کا حقیقی منصب اجرائیہ کا ہے۔

قانون سازی میں اس کا حصہ صرف اس قدر ہے کہ وہ قرآن کریم میں بیان کردہ اصول و اقدار کی روشنی میں اپنے اپنے حالات کے مطابق جزئیات مرتب کرے۔

جو لوگ دین اور مذہب میں فرق کرنا نہیں جانتے ان کا خیال (بلکہ عقیدہ) ہے کہ وحیٔ خداوندی کا منشاء انسانوں کی "اخلاقی اصلاح" ہے جو پندونصائح اور وعظ و تلقین کے ذریعے کی جاتی ہے۔ سیاست اور حکومت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ "مذہب" کی بے شک یہی تعلیم ہے۔ وہ وعظ اور اپدیش سکھاتا اور انسان کو گیان دھیان (یعنی خود ساختہ تصورِ روحانیت) میں مگن رکھتا ہے۔ لیکن اسلام دین ہے، اور دین سے مراد نظام حکومت اور ضابطۂ قوانین ہے۔ وہ نظامِ حکومت کو ایمان و اعمالِ صالح کا فطری نتیجہ قرار دیتا ہے۔ دیکھئے! اس نے ایک ہی آیت میں، حکومت کے قیام اور اس کی غرض و غایت کو کیسے واضح اور دل نشین انداز میں بیان کر دیا ہے۔ سورۂ نور میں ہے۔

(۱) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔

یہ خدا کا وعدہ ہے۔ یہ اس کا غیر متبدل قانون ہے کہ جو لوگ وحی کی ابدی صداقتوں کو اپنا نصب العین قرار دے کر اس کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق کام کریں، انہیں دنیا میں حکومت (خلافت) عطا ہوگی۔

(۲) كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ یہ محض نظری اور اعتقادی "حکومت" نہیں جو عالمِ تصورات کی روحانی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ یہ اس قسم کی حکومت ہے جس قسم کی حکومت اور قوموں کو حاصل ہوتی ہے

(۳) اس حکومت کا مقصد یہ ہے کہ

(ا) وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ۔ تاکہ اس کے ذریعے اس دین کو تمکن حاصل ہو جائے جسے خدا نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔

(ب) وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔ اور انہیں کسی قسم کا خوف و خطر نہ رہے اور امن و سکون نصیب ہو جائے۔

(ج) يَعْبُدُوْنَنِيْ۔ تاکہ یہ اس قابل ہو جائیں کہ صرف میری محکومیت اختیار کریں۔ میرے قوانین کی اطاعت کریں۔ اور

(د) لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا (۲۴/۵۵)۔ اور اس میں کسی اور کی حکومت و اقتدار کو شریک نہ کریں۔ دوسری جگہ فرمایا کہ — اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ — یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں دنیا میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ۔

(ا) اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ـــــ ایسا نظام قائم کریں گے جس میں ہر شخص قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتا چلا جائے۔

(ب) وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ ـــ جس میں تمام افرادِ انسانیہ کو سامانِ نشوونما بہم پہنچتا چلا جائے

(ج) وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ ۔ یہ ان باتوں کے کرنے کا حکم دیں گے جنہیں قرآن صحیح قرار دے۔

(د) وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ اور ان باتوں سے روکیں گے جنہیں قرآن معیوب قرار دے مختصراً یہ کہ

(س) وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۱) اس نظام میں ہر معاملہ آخرالامر قانونِ خداوندی کی طرف (Refer) کیا جائے گا کہ وہاں سے اس کے متعلق کیا فیصلہ ملتا ہے۔

جو لوگ اسلام کو دین نہیں بلکہ ایک مذہب سمجھتے ہیں وہ یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی کے دوران حکومت و مملکت کا کوئی تصور سامنے نہیں تھا۔ یہ خیال ان حالات کا پیدا کردہ تھا جو بعد میں مدنی زندگی میں پیدا ہوئے۔ یعنی حضورؐ کا مقصد کسی مملکت کا حصول یا حکومت کا قیام نہیں تھا۔ مدنی زندگی میں اتفاقی طور پر ایسے حالات نمودار ہو گئے جن سے ایک مملکت وجود میں آگئی ـــــ یہ حدیث بے خبراں ہے

مکی زندگی میں تصورِ حکومت

حقیقت یہ ہے کہ اپنی دعوتِ انقلاب کے روزِ اول سے یہ مقصد حضورؐ کے پیشِ نظر تھا۔ آپ نے مکہ میں، دعوئے نبوت کے آغاز ہی میں جو فرامین نافذ کئے ان میں وہ فرمان بھی ہے جس میں اپنے خاندان کو مخاطب کر کے حضورؐ نے فرمایا۔

> آج تک کوئی جوان ایسا پیدا نہیں ہوا جو تم کو مجھ سے بہتر مطمحِ نگاہ سے باخبر کرتا۔ میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری کے لئے آیا ہوں۔ خدا کی بالادست حکومت کی طرف سے مجھے یہ ہدایت ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ مجھے اس حکومت کے کام میں وزراء کی ضرورت ہے۔ کون ہے جو میرے ساتھ وزیر کی حیثیت سے کام کریگا؟ [1]

یہ مؤرخ اس فرمان کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ نبوت کے تین ہی سال بعد حضورؐ نے لوگوں کو "خدا کے حکم" پر جمع ہونے کی دعوت دی۔ یہ بڑی انقلاب آفریں دعوت اور انتہائی صبر آزما مرحلہ تھا۔ لیکن حضورؐ کا اعلان یہ تھا کہ "یا تو خدا کا حکم غالب ہوگا۔ اور یا میں اپنی جان سے گذر جاؤنگا"

بنی عامر کا سردار

اسی زمانے کا ذکر ہے کہ بنی عامر کا ایک سردار حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ان لکل قول حقیقة۔ وما حقیقة قولك۔ ہر دعوے کا نتیجہ ایک

---

[1] تاریخ الکامل ابن اثیر (بحوالہ اسلام کا نظامِ حکومت)۔

محسوس شکل میں سامنے آتا ہے۔ آپ کے دعوے کا ماحصل اور نتیجہ کیا ہے؟ آپ نے اپنی دعوت کی وضاحت کے بعد فرمایا کہ اگر تم اسے قبول کرو گے تو اس کے نتیجہ میں آخرت کی ہمیشہ رہنے والی خوشگوار زندگی نصیب ہوگی۔ عامری نے کہا کہ یہ تو بعد کی بات ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے اس دنیا میں کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا کہ نصر النصر و تمکین فی البلاد۔ نہایت عمدہ فتوحات اور ملکوں پر حکومت۔ (تاریخ الکامل)۔

لہٰذا، مکی زندگی اس حکومت کے قیام کی تیاری کا زمانہ تھا۔ وہ اس متشکل ہونے والی مملکت کے کتابِ آئین کا دیباچہ تھی۔ اگر حکومت کو تلوار کے زور پر حاصل کرنا مقصود ہو تو اس کے لئے تیاری کا انداز اور ہوتا ہے۔ لیکن جب حکومت کو ایمان اور اعمالِ صالح کے فطری نتیجہ کے طور پر سامنے آنا ہو، تو اس کی تیاری، اپنی جماعت کو ان صبر آزما اور جانگسل کٹھالیوں سے گذار کر ہی ہوسکتی تھی جو مکی زندگی کے طول طویل زمانہ میں قدم قدم پر سامنے آتی تھیں۔ اس کے بعد مدنی زندگی میں اگرچہ یہ حکومت اپنی محسوس شکل میں سامنے آچکی تھی لیکن یہ مرحلہ بھی درحقیقت تربیت گاہ تھا ان فیروزبخت اور سعادت مند رفقائے جماعت کا جنہوں نے حضورؐ کے بعد اس مقصدِ عظیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔

اجرائیہ کی اہمیت

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ قانون سازی نہیں بلکہ قوانین خداوندی کا عملی نفاذ ہے اور اس جہت سے اس کی حیثیت اجرائیہ (یا انگریزی میں ایگزیکٹو) کی رہ جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ معاشرہ کی اصل (بنیاد) کا تعلق قانون سازی ہی سے ہے۔ جس قسم کے قوانین اسی قسم کا معاشرہ۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ معاشرہ میں حکومت کے نظام اجرائیہ کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ لوگوں کا براہِ راست واسطہ تو اجرائیہ ہی سے پڑتا ہے۔ قانون کیسا ہی انسانیت ساز اور نفع بخش کیوں نہ ہو، اگر اس کے نافذ کرنے اور چلانے والوں کا کردار بلند اور نگاہ وسیع نہیں، تو وہ لوگوں کے لئے قیامت برپا کر دیتے اور ان کی زندگی کو جہنم بنا دیتے ہیں۔ نبی اکرمؐ نے تربیت گاہِ مدنی میں، اس حقیقت کو واشگاف کر دیا کہ خدا کی بادشاہت میں، حاکم اور محکوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس میں ہر فیصلہ خدا کے عطا کردہ قوانین کی روشنی میں ہوتا ہے اور ان قوانین کا اطلاق، قانون نافذ کرنے والوں اور دوسرے لوگوں پر یکساں ہوتا ہے۔ بلکہ قانون نافذ کرنے والوں کو سب سے پہلے اعلان کرنا پڑتا ہے کہ انا اول المسلمین۔ میں ان قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والوں میں سب سے پہلے نمبر پر ہوں۔

محکوم فرمانروا

یعنی وہ بھی، دوسرے لوگوں کی طرح، سب سے پہلے خدا کا محکوم بنتا ہے۔ اور اس محکومیت (اطاعتِ قوانین خداوندی) ہی سے اسے شرفِ تکریم

کا وہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ قوانین خداوندی کے نفاذ کا اہم فریضہ اس کے سپرد کیا جاتا ہے۔ وہ انتہائی فخر و مسرت سے اپنے آپ کو خدا کا عبد کہتا ہے اور اس کا خدا بھی جو سب سے بڑا اعزاز اسے عطا کرتا ہے وہ عبدیت ہی کا مقام ہوتا ہے (فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی۔ ۵۳/۱۰) اس اعتبار سے وہ خدا کا محکوم اور دنیا کا حاکم بنتا ہے۔ اور چونکہ خدائی اس حکومت میں دوسرے لوگ بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں اس لئے وہ ان کا حاکم اور فرماں روا بن کر بھی اپنے آپ کو ان سے اونچا اور برتر نہیں سمجھتا۔ دیکھئے کہ حضورؐ نے اپنے عدیم النظیر عمل سے اس حقیقت کو کس طرح نمایاں کر کے دکھا دیا۔ آپؐ کم از کم دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کے واحد حکمران تھے۔ لیکن اس وسیع و عریض مملکت کے واحد حکمران کی کیفیت یہ تھی کہ۔

(۱) ایک مرتبہ کسی نے آپ سے خطاب کرتے ہوئے کہدیا یا سیدنا (اے ہمارے آقا) اس پر آپ نے ڈانٹ کر کہا کہ دیکھو! تمہیں شیطان بہکا رہا ہے۔ آقا صرف خدا کی ذات ہے۔ میں تو عبداللہ کا بیٹا محمدؐ۔ اور خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ آقائیت (سروری اور سرداری) صرف ذات خداوندی کے لئے ہے۔ کسی اور کے لئے نہیں۔

(۲) اور سنئے۔ دوسرے قبائل کے نمائندے اور سلطنتوں کے وفود آتے تو انہیں پہچاننے میں دقت ہوتی کہ مسلمانوں کی سلطنت کا فرمانروا کون ہے۔ اس دقت کے پیش نظر حضورؐ کے رفقاء نے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا کہ آپؐ اس پر بیٹھا کریں۔ آپ نے دیکھا تو غصہ سے چہرہ تمتما اٹھا۔ اپنے پاؤں سے اس نشست کو گرا دیا اور فرمایا کہ تم بھی کیسے ہو وہی امتیازات پیدا کرنے جنہیں مٹانے کے لئے میں آیا ہوں۔ تم نے آج مٹی کا چبوترہ بنایا ہے۔ آنے والے اسے تخت حکومت میں تبدیل کر دیں گے۔

(۳) کسی کے ہاں دعوت میں جا رہے تھے۔ چار آدمیوں کی دعوت تھی۔ راستے میں ایک آدمی یونہی ساتھ ہو گیا۔ آپ نے میزبان کے ہاں پہنچکر اس سے کہا کہ یہ صاحب! اس طرح میرے ساتھ آ گئے ہیں۔ اگر تم اجازت دو تو اسے کھانے پر ساتھ بٹھا لیا جائے۔ ورنہ رخصت کر دیا جائے۔

(۴) وہ دیکھو! دیوار کے سایہ تلے بیٹھا کون اپنے جوتے کی مرمت کر رہا ہے؟ یہ وہی دس لاکھ مربع میل مملکت کا حکمران ہے۔ ایک رفیق نے کہا کہ لائیے۔ آپ کا جوتا میں گانٹھ دوں۔ تو ایک تبسم حنت فروش سے فرمایا کہ نہ بھائی! ہر شخص کو اپنا کام خود کرنا چاہیئے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۵۳/۳۸)

(۵) اس وسیع و عریض سلطنت کے فرمانروا کے گھر کا سامان کیا تھا؟ دروازے پر ایک کمبل کا پردہ (کوئی حاجب و دربان نہیں)۔ اندر فرش پر ایک چٹائی جس پر سونے سے بدن مبارک پر نشان پڑ جاتے تھے۔ سرہانے ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری تھی۔ ایک طرف کھونٹی پر دو ایک مشکیزے پانی کے لئے۔

اور دوسری طرف" ایک تلوار اور زرہ ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔ غذا میں کھجوریں اور ان کی گٹھلیوں کے ستو۔ لباس میں ایک ہی جوڑا جس میں کئی پیوند لگے ہوئے ۔ آخری وقت گھر میں سات دینار تھے جنہیں وفات سے پہلے بیت المال میں بھیجدیا کہ محتاجوں کے کام آئیں۔ یہ تھی اس عظیم مملکت کے فرمانروا کی زندگی اور اس کا سازوسامان ۔

رسالت کی حیثیت

میں نے ' عزیزانِ من ! کہا ہے کہ یہ کیفیت تھی اس بطل جلیل کی جو اتنی وسیع سلطنت کا واحد حکمران تھا۔ لیکن آپ کی ایک حیثیت اس سے بھی بلند تھی۔ ایسی بلند جو کسی اور انسان کے حصے میں نہیں آسکتی تھی۔ اور وہ یہ کہ آپ خدا کے رسول تھے جن پر ایمان لانے کے بعد ایک شخص مسلمان کہلا سکتا تھا ۔ صرف ایمان لانے ہی سے نہیں بلکہ خدا کا ارشاد یہ تھا کہ

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ - ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا - (۴/۶۵) -

تیرا نشوونما دینے والا اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے تمام متنازعہ فیہ معاملات میں تجھے اپنا فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں ۔ اور پھر ان کی کیفیت یہ ہو کہ تیرے فیصلے کے خلاف اپنے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں بلکہ اس کے پورے جھکاؤ کے ساتھ اسے تسلیم کرلیں ۔

اور اس کے ساتھ ہی آپ کی ایک حیثیت ذاتی بھی تھی۔ جب ایک ہی ذات میں اس قسم کی مختلف حیثیتیں سموئی ہوئی ہوں تو ان میں فرق کرنا ' اور ایسا فرق کرنا کہ ایک حیثیت کا شائبہ بھی دوسری حیثیت میں نہ جانے پائے ' کار ہر فرزانہ نیست ۔ اس باب میں حضورؐ نے مختلف مقامات پر ایسی محیرالعقول مثالیں پیش کی کہ جب نگۂ بصیرت ان پر غور کرتی ہے تو بے ساختہ تحسین و آفرین کے نغمات زبان پر آجاتے ہیں۔ ان میں بلند ترین، عمیق ترین اور نازک ترین مثال وہ ہے جسے خود قرآن کریم نے اپنے دامن میں محفوظ کرلیا ہے کہ قیامت تک کے ارباب اقتدار کو معلوم ہو جائے کہ قانون کی فرماں روائی اور اپنے ذاتی جذبات کو کس طرح الگ الگ رکھا جاتا ہے ۔

حضرت زیدؓ کا قصہ

حضرت خدیجہؓ کے پاس ایک غلام تھا زید۔ انہوں نے اسے رسول اللہؐ کو دیدیا۔ حضورؐ نے اسے آزاد کرکے وہ بلند مقام عطا کردیا۔ جس پر ہر بلند سے بلند تر مقام کی بلندیاں نچھاور کی جاسکتی ہیں۔ یعنی حضورؐ نے اسے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔

حضرت زیدؓ کی بلندیٔ مرتبت کی یہ آخری حد نہیں تھی۔ اور آگے بڑھئے تو حضورؐ نے ان کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے کر دی۔ لیکن سوئے اتفاق کہ میاں بیوی میں ناچاقی ہو گئی اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ حضرت زیدؓ نے بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا۔ حضورؐ نہیں چاہتے تھے کہ ایسا ہو۔ اس کی وجوہات ظاہر ہیں۔ آپؐ (حضرت) زیدؓ کے پاس گئے اور کہا کہ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ - (۳۳/۳۷)۔ اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔

سوچئے برادرانِ عزیز! کہ یہ کہنے والا کون ہے!

وہ رسولؐ جس پر ایمان لانے سے زیدؓ کو شرفِ اسلام حاصل ہوا۔

وہ امیرؐ جس کی مملکت میں زیدؓ رعایا کے ایک فرد کی حیثیت سے رہتے ہیں

وہ محسنِ اعظمؐ جس نے زیدؓ کو غلامی سے آزاد کیا۔

وہ جو زیدؓ کے لئے بمنزلہ باپ کے ہیں۔ اور جنہوں نے خود زیدؓ کی شادی اس ممتاز خاتون سے کرائی تھی۔ یہ ہیں کہنے والے! اور کہا یہ جا رہا ہے کہ زیدؓ! میری بہن کو طلاق نہ دو۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا؟ قرآن بتاتا ہے کہ زیدؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی۔

پھر کیا ہوا؟ پہلے آپ یہ سوچئے کہ اگر آج کسی محسن کا احسان مند، کسی باپ کا بیٹا، کسی پیر کا مرید، کسی افسر کا ماتحت، کسی حاکم کی رعایا کا ایک فرد، ایسی حرکت کرتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ لیکن وہاں کیا ہوا؟ وہی (حضرت) زیدؓ۔ وہی ان کے ساتھ خوشگوار تعلقات حتیٰ کہ حضورؐ نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری ایام میں جو عظیم لشکر مرتب فرمایا تھا اس میں دیگر جلیل القدر صحابہؓ بہ حیثیت سپاہی کام رہے تھے اور ان کا سپہ سالار اسی (حضرت) زیدؓ کا بیٹا، اسامہ بن زیدؓ تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اپنی حیثیت حاکمیہ اور ذاتی حیثیت میں کس طرح فرق کر کے بتا دیا؟ اور اس سے بھی دلگداز اور رقت انگیز وہ واقعہ ہے جس کا ذکر علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک مقالہ میں بڑے ہی سوز و گداز کے ساتھ کیا ہے۔

یہودی کی لڑکی

ایک یہودی قتل کے جرم کا مرتکب تھا۔ اسے حضورؐ نے بہ حیثیت جج سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ اس حکم کی تعمیل ہونے والی تھی کہ اس مجرم کی خورد سالہ بچی، روتی، چیختی، چلاتی دوڑی ہوئی آئی اور حضورؐ کی ٹانگوں سے لپٹ کر ایسے درد انگیز انداز سے آہ و فغاں کی کہ حضورؐ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے سزا کا حکم نافذ کر دیا۔ صحابہؓ کے دریافت کرنے پر جو جملہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا، وہ ان دونوں حیثیتوں کے درمیان قیامت تک حدِ فاصل کا کام دے گا۔ آپ نے فرمایا —— محمدؐ بن عبداللہ کی آنکھ روتی ہے۔ اور محمد رسول اللہ خدا کا حکم نافذ کرتا ہے!

اور خدا کا حکم نافذ کرنے میں یہی وہ غیر جانبداری تھی جس کی بنا پر حضورؐ نے فرمایا تھا کہ
تم سے پہلی اُمتیں اس لئے تباہ ہوگئیں کہ وہ لوگ کم تر درجے کے مجرموں کو قانون کے مطابق سزا دیتے تھے اور اونچے درجے والوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، اگر محمدؐ کی اپنی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں ضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔
اپنی بیٹی ہی نہیں۔ بلکہ خود اپنی ذات کے متعلق (قرآن کریم نے حضورؐ سے) کہلوا دیا کہ

اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۶/۱۵)

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو مجھے ڈر ہے کہ
میں بھی خدا کے مواخذہ سے نہیں بچ سکتا۔

اسلامی حکومت کا مقصد

قرآن کریم کی رو سے، حکومت مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس مقصد کی تفصیل تو طول طویل ہے لیکن اگر ہم اسے دو فقروں میں سمٹانا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مقصد ملک کے اندر امن قائم کرنا (تاکہ اس فضا میں لوگوں کی پوری پوری نشوونما ہوتی جائے) اور دنیا میں کہیں بھی ظلم ہو رہا ہو، مظلوم کی مدد کرنا ہے۔ جہاں تک اندرونِ ملک قیامِ امن کا تعلق ہے نبی اکرمؐ نے اس کا ایسا حسین اور نازک معیار قائم کیا کہ آج، جبکہ بظاہر دنیا میں بڑا امن ہے، جب اس معیار کو بہ نگاہِ تفکر دیکھا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ امن کا اس سے بلند معیار کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ عرب میں حالت یہ تھی کہ اور تو اور خود حریمِ کعبہ کے اندر بھی کوئی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ حکومتِ خداوندی کے قیام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یمن سے ایک عورت سونے کے زیور سے لدی ہوئی تنہا شام تک کا سفر، صحراؤں اور بیابانوں میں کریگی اور اس کے دل میں وہم تک بھی نہیں گذرے گا کہ اسے کسی قسم کا خطرہ ہے ——— اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ حضورؐ کی وفات کے وقت، عرب میں امن کی واقعی یہ حالت ہو چکی تھی۔ ذرا اندازہ لگائیے امن کی اس حالت کا آج کی حالت سے، جب کہ بچیوں کا گھر سے اسکول تک جانا ایک جانکاہ مسئلہ بن جاتا ہے۔

مظلوموں کی امداد

جہاں تک مظالم کی روک تھام کا تعلق ہے، اس باب میں حضورؐ نے کیا اقدامات کئے اس کا اندازہ آپ کے ان خطوط سے لگایا جا سکتا ہے جو آپ نے ایران کے کسریٰ اور روم کے قیصر کو لکھے تھے۔ سطح میں ایران اور روم کے خلاف اسلامی جنگوں کے اسباب و توجیہات کے سلسلہ میں عجیب عجیب چیستانیں پیش کرتے اور افسانے تراشتے رہتے ہیں لیکن ان کی

نگاہ اس علت العلل تک نہیں جاتی جو حضورؐ کے ان خطوط میں ایسی واضح طور پر بیان کی گئی ہے۔ آپ نے اپنے نامہ جات گرامی قدر میں انہیں لکھا تھا۔

میں تم کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر اسے مان لو گے تو دنیا میں بھی بچ جاؤ گے اور اللہ تعالےٰ تمہیں اس کا دگنا اجر دے گا۔ اگر تم نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو تمہارے کسانوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں اور وہ اپنی جہالت کے باعث جو غلطیاں کر رہے ہیں، ان کے تم ذمہ دار ہو گے [1]

آپ نے غور فرمایا کہ حکومتِ خداوندی کی دنیا میں غائت کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ سوال ہی نہیں کہ ظالم کون ہے اور ظلم کس پر ہو رہا ہے۔ دنیا کے کسی خطے میں، کسی مظلوم پر بھی ظلم ہو رہا ہو، اس کی مدد کو پہنچنا، اس حکومت کا فریضہ قرار پاتا ہے۔ حضورؐ کے ان فرامین میں اسی حقیقت کبریٰ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ جو حکومت، دوسری مملکتوں کے مظلوموں کی حامی اور مددگار بنے گی وہ اپنے ہاں کس طرح ظلم روا رکھے گی؟ خود ظلم کرنا تو ایک طرف، ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص کسی ظالم کی مدد کے لئے نکلا، درآنحالیکہ وہ جانتا ہے کہ وہ شخص ظالم ہے۔ تو وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ ظالم کی مدد کرنا تو ایک طرف، آپ نے یہاں تک بھی فرما دیا کہ اگر کسی شخص نے حاکم کو راضی کرنے کے لئے ایسی بات کہی جس سے اس کا خدا ناراض ہو جائے (یعنی جو قانونِ خداوندی کے خلاف ہو) وہ بھی اللہ کے دین سے نکل جائے گا۔ (کنز العمال) بات ظلم کی ہو رہی تھی۔ ظلم بڑا جامع لفظ ہے اور اس کے احاطہ میں چھوٹی سے چھوٹی بے انصافی سے لے کر بڑے سے بڑے مظالم تک سب آجاتے ہیں۔ اس باب میں

فریب کے خلاف

حضورؐ کی جزرسی اور دقیقہ شناسی کا یہ عالم تھا کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، ہر وقت اور ہر جگہ نگاہ رکھتے تھے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو دھوکا نہ دے۔ اس سے فریب نہ کرے کہ یہ بھی ظلم ہے۔ ایک دفعہ آپ بازار سے گذر رہے تھے کہ ایک غلہ فروش کی دکان نظر آئی۔ آپ نے غلہ کے انبار کے اندر ہاتھ ڈالا تو وہ بھیگا ہوا تھا۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ بارش سے بھیگ گیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ پھر بھیگا ہوا غلہ اندر کیوں رکھا ہے۔ اسے اوپر کیوں نہیں رکھا تاکہ ہر شخص کو نظر آجائے۔ پھر فرمایا کہ یاد رکھو! جو فریب دیتا ہے وہ ہم میں سے نہیں (صحیح مسلم۔ کتاب الایمان)

عمال کا محاسبہ

جہاں تک محاسبہ کا تعلق ہے، حضورؐ اپنے عمال حکومت (عاملین) پر بڑی کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ جب عمال زکوٰۃ وغیرہ وصول کر کے لاتے تو آپ بڑی سختی سے اس امر کا جائزہ لیتے کہ انہوں نے کوئی ناجائز طریقہ تو نہیں اختیار کیا۔ چنانچہ ایک بار ایک عامل زکوٰۃ (حضرت ابن اللتبیہ) کا آپ نے جائزہ لیا تو انہوں نے کہا کہ یہ مال بیت المال کا ہے اور یہ چیزیں ان

[1] بخاری۔ باب بدء الوحی

لوگوں نے مجھے بطور تحفہ دی ہیں۔ آپ نے وہ چیزیں ان سے لے لیں اور کہا کہ یہ چیزیں تمہیں گھر بیٹھے بیٹھے کیوں نہیں مل گئیں؟ اس کے بعد آپ نے عام خطبہ میں اس کی سخت مذمت فرمائی اور اس طرح تحائف دینے والوں اور لینے والوں کو۔ اسی طرح تنبیہ کی جس طرح رشوت لینے والوں اور دینے والوں کو عذاب الیم کی وعید سنائی تھی۔

آپ نے اس طرح عملی مثالوں سے اپنی جماعت کی تربیت فرمائی اور دنیا کو بتا دیا کہ حدود میں یہ قوانین نافذ کرنے والوں کی اپنی زندگی کیسی ہونی چاہیئے اور انہیں ہر معاملہ کا جائزہ کس حزم و احتیاط اور وقت نظر سے لینا چاہیئے۔ ذمہ داریوں کا یہی احساس تھا جس سے حضورؐ کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ

> (حضرت) عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا آنحضرتؐ کبھی بیٹھ کر بھی نماز پڑھتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ جب لوگوں (کے معاملات) نے انہیں چور چور کر دیا تھا۔ (ابوداؤد)

میں نے، برادران عزیز! حضورؐ کی حیات طیبہ کے ایسے واقعات آپ کے سامنے پیش کئے ہیں جو بظاہر بڑے چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں لیکن میرے بھائیو! کسی کے کیریکٹر کا صحیح اندازہ تو روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات ہی سے لگ سکتا ہے۔ بڑے بڑے کارنامے، انسان کی سوچی سمجھی اسکیموں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن روزمرہ کی زندگی کے معمولی واقعات، جو بے ساختہ سرزد ہوتے ہیں، انسانی سیرت کے صحیح آئینے اور اس کی عظمت کے قابل اعتماد پیمانے ہوتے ہیں۔ "لوگوں کے معاملات" کا احاطہ عدالت یا باب حکومت تک ہی محدود نہ تھا۔ ان کا دائرہ زندگی کے ہر گوشے کو محیط تھا۔ مثلاً حضرت خباب ایک صحابی تھے جنہیں آپ نے ایک غزوہ پر بھیجا۔ ان کے ہاں کوئی اور مرد نہیں تھا اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہیں آتا تھا۔ آپ بہ نفس نفیس ہر روز ان کے ہاں جاتے اور جانوروں کا دودھ دوہ کر دے آتے۔ (طبقات ابن سعد) مدینہ کی لونڈیاں آپ کی خدمت میں آتیں اور کہتیں کہ یا رسول اللہ! میرا یہ کام ہے۔ آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کا کام کر دیتے۔

آپ ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ آپ کو ان میں کہیں بھی حکومت کی ذرا سی بو، اقتدار کا ہلکا سا رنگ اور جاہ و منزلت کا خفیف سا شائبہ بھی محسوس ہوتا ہے؟ کیا آپ کو کسی مقام پر بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعات زندگی ایک ایسے انسان کے ہیں جو دس لاکھ مربع میل پر مشتمل حکومت کا واحد فرمانروا ہے؟ یہ ہے وہ صحیح معیار جس پر آسمانی حکومت کے نمائندہ کو پورا اترنا چاہیئے۔ یعنی کسی مقام

پر بھی یہ محسوس نہ ہو کہ یہ حاکم ہے اور دوسرے لوگ محکوم۔ یہ فرماں روا ہے اور دوسرے فرماں پذیر۔ یہ مطاع ہے اور وہ مطیع۔ یہ بلند ہے۔ وہ پست۔ اُسے دیکھا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے کہ ہاں یہی ہے وہ بارگاہ جہاں یہ کیفیت ہے کہ

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
اس کی درگاہ میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

آخری وصیت

اور یہ سب اس لئے تھا کہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک قدم قرآن کریم کی روشنی میں اٹھتا تھا۔ اسی کی تاکید آپ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں فرمائی۔ چنانچہ حضورؐ نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں ایک لاکھ کے مجمع میں ارشاد فرمایا کہ

قد ترکت فیکم مالم تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ۔ کتاب اللہ (بخاری جلد الاول)

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم نے اسے قوت سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اور وہ ہے اللہ کی کتاب۔ قرآن کریم۔

اور اس کی عملی تعبیر کے متعلق آپؐ نے فرمایا کہ

اگر ایک بینی بریدہ سیاہ فام حبشی تمہارا امیر ہو اور وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (صحیح مسلم)۔

حضورؐ کے بعد

حکومتِ خداوندی کے اس سلسلۂ زریں کو حضور نبی اکرمؐ کی ذات تک محدود نہیں رہنا تھا۔ قرآن کریم شاہد ہے کہ اسے حضورؐ کے بعد آگے چلنا تھا۔ اس لئے کہ یہ دین تھا جو نہ زمان و مکان کی حدود میں مقید ہوتا ہے اور نہ اشخاص کی موت و حیات سے وابستہ۔ یہ وہ حقیقت تھی جس کا اعلان نبی اکرمؐ نے مدینہ کی زندگی کے ابتدا ہی میں فرما دیا تھا جب ہنوز دلی محسوس شکل میں، حکومت وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔ مدینہ پہنچنے کے بعد پہلا کام مسجد نبویؐ کی تعمیر تھا کہ وہی اس مملکت کا ایوانِ حکومت اور اس حکومت کا دارالمشاورت تھا۔ مسجد تعمیر ہو رہی تھی۔ اور صحابہ کبارؓ مزدوروں کی طرح مٹی اور پتھر لا رہے تھے۔ حضورؐ ان معماروں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور فرما رہے تھے ھٰؤلاء ولاۃ الامر بعدی۔ یہ وہ افراد ہیں جو میرے بعد حکومت کے افسرانِ

اعلے ہونگے[1] اور خود صحابہؓ کبار کو بھی اس کا علم اور یقین تھا۔ چنانچہ حضورؐ کی وفات کے بعد کہیں حضرت سہیلؓ بن عمرو، کعبہ کے دروازہ پر کھڑے ہوئے اور اعلان کیا کہ

خدا کی قسم اسلام کا کام پورا ہوگا۔ میں نے حضورؐ کی زبان مبارک سے یہ سنا ہے (کہ آپ نے فرمایا تھا)" لوگو! میرے ساتھ لاالٰہ الا اللہ کہو۔ عرب تمہارے تابع فرمان ہونگے۔ عجم باجگزار۔ خدا کی قسم تم قیصر و کسریٰ کے خزانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے"

"تاریخ الکامل"

اس اسکیم کو حضورؐ کے جانشینیان گرامی قدرؓ کے ہاتھوں پورا ہونا تھا جن کی تعلیم و تربیت حضورؐ نے اس انداز سے فرمائی تھی۔ آ یئے ہم ایک جھلک اس دور کی بھی دیکھتے چلیں۔

صدیقِ اکبرؓ

رسول اللہؐ کی وفات کے بعد یہ اہم ذمہ داری حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سپرد کی گئی تو آپ نے اپنے پہلے خطبہ میں واضح کر دیا کہ ان کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

مجھے یہ ذمہ داری تفویض تو کر دی گئی ہے لیکن میں اپنے آپ کو اس بارِ گراں کے اٹھانے کے قابل نہیں پاتا۔۔۔۔۔ میں بھی تمہاری طرح اللہ کا بندہ ہوں مگر تم میں سے کسی سے بھی بہتر نہیں۔ تم میرے کاموں کی نگہداشت کرو۔۔۔۔۔ تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جبتک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں لیکن میں اگر اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔

اس کے بعد انہوں نے حکومت خداوندی کی غرض و غایت ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان فرمائی جو اس قابل ہیں کہ دنیا میں ہر عادل حکومت کا منشور قرار پائیں۔ آپ نے فرمایا۔

یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور، طاقتور ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں۔ اور ہر طاقتور کمزور ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ لیا جائے۔

آپ نے اپنے ذاتی اخراجات کے لئے جو وظیفہ مقرر کیا وہ ایک مزدور کی اُجرت کے برابر تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کا احساس اسقدر شدید تھا کہ آپ نے اپنے مرض الموت میں اپنے متعلقین سے فرمایا کہ میں نے جسقدر رقم بیت المال سے اپنے اخراجات کے لئے لی ہے معلوم نہیں کہ اس کے

---

[1] البدایہ والنہایہ (جلد دوم)۔

مطابق اُمت کا کام بھی کیا ہے یا نہیں۔ اس لئے آپ لوگ میرا مکان فروخت کر دیں اور یہ رقم بیت المال میں داخل کر دیں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا اور حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ کہکر اطمینان کا سانس لیا کہ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں کم از کم اس قسم کے محاسبۂ خداوندی سے تو سرخرو ہو گیا

حضرت عمرؓ

حضرت عمرؓ نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں فرمایا تھا کہ۔

لوگو! یاد رکھو۔ کوئی صاحب اختیار دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کی جائے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا۔

لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔ تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ جو مال خدا عطا کرے میں اس میں سے کوئی چیز وصول نہ کروں مگر قانونِ خداوندی کے مطابق۔ اور جو مال میرے پاس آئے اس میں سے کچھ نہ نکلے مگر حق کے مطابق۔ (کتاب الخراج)۔

ایک دوسرے موقعہ پر آپ نے کہا۔

یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر ظلم اور زیادتی کریگا تو میں اُس وقت تک اسے نہیں چھوڑ دونگا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں ٹکا دوں تاآنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز نہ ہو جائے۔ لیکن تم میں سے حقدار کے لئے میں خود اپنا رخسار زمین پر رکھ دونگا۔ (بحوالہ ہیکل)۔

ان حقوق و واجبات کے سلسلہ میں آپ نے یہ بھی صراحت کر دی کہ

لوگ اپنے امیر کے حقوق اس وقت تک ادا کریں گے جب تک امیر اللہ کے حقوق ادا کرے گا۔ جب امیر خدا کی اطاعت سے بے قید ہو جائے گا تو لوگ اس کی اطاعت سے بے قید ہو جائیں گے۔

خلافت اور ملوکیت

وہی بات کہ حق حکومت اُسے حاصل ہو گا جو خدا کا محکوم ہو گا۔ جس نے خدا کی اطاعت چھوڑ دی اسے دوسروں سے اطاعت کرانے کا حق نہ رہا۔ وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہتے تھے کہ بتاؤ کہ میں صحیح طریقے پر چل رہا ہوں یا کہیں لغزش کھا گیا ہوں۔ ایک موقعہ پر آپ نے ان سے کہا کہ "میں یہ نہیں جانتا کہ میں خلافت سے روگردانی کر کے شاہی تو نہیں کر رہا۔ مجھے بتائیے۔" مجمع میں سے ایک شخص برجستہ بولا۔ "امیر المومنین! خلافت اور شاہنشاہیت کا فرق بڑا واضح ہے۔

خلیفہ تمام افرادِ معاشرہ کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے، اور بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور جبر کرتا ہے۔ وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے دوسری طرف خرچ کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں۔ بادشاہ نہیں۔

(طبقات ابن سعد)

خلیفہ کا حق

یہ جو آپ نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے مال میں سے میں صرف اتنا لے سکتا ہوں جتنا قانون کی رُو سے مجھے حق پہنچتا ہے۔ تو اس حق کی تفصیل بھی آپ نے خود ہی بتا دی۔ ایک دن اُن سے کسی نے پوچھا کہ مسلمانوں کے مال میں سے آپ کیلئے کیا جائز ہے آپ نے کہا کہ

کپڑوں کے دو جوڑے۔ ایک گرمی کا اور دوسرا سردی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے احرام۔ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے کم نہ زیادہ۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ جو ان کا حال سو میرا حال۔

احتیاط کی شدت

اس باب میں وہ اتنی احتیاط برتتے تھے کہ بعض اوقات یہ احتیاط تکلیف رساں ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ انہیں کوئی شکایت ہو گئی۔ جس کے لئے شہد تجویز کیا گیا۔ بیت المال میں شہد موجود تھا۔ لیکن آپ نے اسے از خود نہیں لیا۔ آپ نے "کونسل" کا اجلاس طلب کیا اور کہا کہ اجازت دیں تو میں بیت المال میں سے تھوڑا سا شہد لے لوں۔ انہوں نے اجازت دے دی تو شہد لیا۔ جب لوگوں نے دیکھا حضرت عمرؓ اپنی جان پر اتنی سختی کر رہے ہیں تو وہ ایک دفعہ حضرت حفصہؓ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ ہی اپنے والد کو سمجھائیں اور ان سے کہیں کہ انہیں جس چیز کی ضرورت ہو، اطمینان سے لے لیا کریں۔ حضرت حفصہؓ نے آپ سے کہا تو آپ نے فرمایا!

اے عمر کی بیٹی! تو نے اپنی قوم کے ساتھ تو بھلائی کی اور اپنے باپ کو دھوکا دیا۔ یاد رکھو! میرے اہل و عیال کا حق میری ذات میں ہے۔ میری دیانت اور امانت میں نہیں۔ (بحوالہ سیکل)۔

بیوی بچوں کا معاملہ

جب "اہل و عیال" کا ذکر آگیا تو دو ایک واقعات اس ضمن میں بھی سُن لیجئے۔ "بیوی بچے" انسان کی بڑی دکھتی ہوئی رگ ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے بھی انہیں فتنہ (آزمائش کی کسوٹی) کہا ہے۔ انسان اپنے آپ پر تو ضبط کر لیتا ہے لیکن جب بیوی یا اولاد کا سوال سامنے آتا ہے تو بڑے بڑوں کے پاؤں پھسل جاتے ہیں۔ اس باب میں حضرت عمرؓ کی احتیاط کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ ان دو ایک واقعات سے لگائیے۔

(۱) ایک دفعہ قیصر کی بیوی نے عطر کی کچھ شیشیاں "شاہ عرب" (حضرت عمرؓ) کی بیوی کو بطور تحفہ بھیجیں۔ آپ نے وہ شیشیاں بیوی سے لے لیں اور فرمایا کہ "وہ بیت المال میں داخل ہونگی اس لئے کہ قیصر کی بیوی نے یہ تحفہ تمہاری ذاتی حیثیت سے نہیں بھیجا۔ امیرالمومنین کی بیوی کی حیثیت سے بھیجا ہے۔ اس لئے تمہارا ان پر کوئی حق نہیں"۔

(۲) ایک مرتبہ بیت المال میں کچھ مشک آئی جسے تقسیم کرنا تھا۔ بیوی نے کہا کہ لائیے! میں تول کر حصے کردوں۔ فرمایا کہ ہاں! تم اسے تولو گی تو جو مشک ترازو کے پلڑے میں لگی رہ جائیگی تم اسے اپنے کپڑوں میں ملو گی۔ میں اس "خیانت" کو گوارا نہیں کرسکتا۔

(۳) ایک دفعہ آپ کا بیٹا مصر سے واپس آرہا تھا۔ گورنر مصر نے کچھ روپے دیئے کہ انہیں بیت المال میں جمع کردینا۔ اس نے کہا کہ اگر میں اس روپے سے راستے میں کچھ سامان تجارت خرید لوں اور مدینہ جاکر اصل رقم بیت المال میں داخل کردوں تو اس میں حرج تو نہیں؟ گورنر نے اس کی اجازت دیدی۔ لیکن جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے کہا کہ زر منافع بھی بیت المال میں داخل کرو۔ گورنر نے تمہیں اس کی اجازت محض اس لئے دیدی کہ تم امیرالمومنین کے بیٹے ہو۔ وہ ہر ایک کو اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے جو رعایت تمہیں عمر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے ملی ہے اسے کبھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں ایک دفعہ ان کے بھائی حضرت عقیلؓ نے کہا کہ مجھے کچھ روپے بطور قرض بیت المال سے دلوا دیجئے تو آپ نے فرمایا کہ میں خدا کے سامنے چور بننا نہیں چاہتا۔ اس معاملہ میں تم حسن۔ اور عام لوگ میرے نزدیک سب ایک جیسے ہیں۔

(۴) ایک دفعہ حضرت عمرؓ کا بیٹا اپنا اونٹ، مملکت کی چراگاہ میں چراتا رہا۔ جب وہ موٹا تازہ ہوگیا تو اسے نفع سے بیچ دیا۔ آپ کو معلوم ہوا تو بیٹے کو ڈانٹا اور کہا کہ زر منافع بیت المال میں داخل کرو۔ تم نے ملت کی چراگاہ میں اپنا اونٹ کس طرح چرالیا۔

(۵) اور ان تمام واقعات سے زیادہ دردانگیز وہ واقعہ ہے جو ان کے صاحبزادہ عبدالرحمٰن کے ساتھ پیش آیا۔ وہ مصر میں تھے۔ ایک دن انہوں نے نبیذ پی لی جس سے نشہ آگیا تو خود ہی والیٔ مصر حضرت عمرو بن عاصؓ کے پاس پہنچے کہ ان پر حد جاری کردی جائے۔ انہوں نے پبلک میں سزا دینے کی بجائے انہیں اپنے گھر کے صحن میں سزا دیدی۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے سخت ناراضگی سے حضرت ابن عاصؓ کو لکھا۔

تم نے عبدالرحمٰن کو اپنے گھر کے صحن میں سزا دی حالانکہ عبدالرحمٰن تمہاری رعایا کا ایک فرد ہے

تمہیں اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیئے تھا جو تم دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہو۔ لیکن تم نے سوچا کہ وہ امیر المومنین کا بیٹا ہے حالانکہ تم جانتے ہو کہ میرے نزدیک کسی شخص سے حق وصول کرنے میں نرمی اور رعایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس وقت تمہیں یہ خط ملے، اُسے اُون کا لباس پہناؤ اور کاٹھی پر بٹھا کر فوراً میرے پاس بھیج دو تاکہ وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جائے۔

عبدالرحمٰن بیمار تھے۔ جب اس طرح کے تکلیف دہ سفر کے بعد باپ کے سامنے پہنچے تو آپ نے کہا کہ عبدالرحمٰن! تم نے یہ حرکت کی ہے؟ ایک اور صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان کی سفارش کی اور کہا کہ امیر المومنین! اس پر حد لگ چکی ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی اس بات پر کوئی دھیان نہ دیا اور بیٹے پر دوبارہ حد لگوائی۔ وہ پہلے ہی بیمار تھا۔ اس تکلیف کو برداشت نہ کر سکا اور باپ کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیا۔

مار بڑوں کی اولاد کو

اور جب اپنے بیٹوں کے ساتھ ان کے سلوک کا یہ عالم تھا تو دیگر عمال حکومت کو وہ اس قسم کی اجازت کب دے سکتے تھے۔ راہنی (حضرت عمرو بن عاصؓ۔ والیٔ مصر) کا واقعہ ہے کہ ان کے بیٹے نے ایک مصری کو کوڑوں سے پیٹا۔ وہ اسے کوڑے مارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ تم نے دیکھا کہ بڑوں کی اولاد کیسی ہوتی ہے؟ حضرت عمرؓ تک بات پہنچی تو انہوں نے اس مصری اور ان باپ بیٹے دونوں کو بلا بھیجا۔ وہی کوڑا مصری کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ اُسے اُسی طرح سے مارو جس طرح اس نے تمہیں مارا تھا۔ وہ کوڑے مارتا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ کہتے جاتے تھے کہ "بڑوں کی اولاد کو مار"۔ جب وہ بدلہ لے چکا تو آپ نے فرمایا کہ ایک آدھ تازیانہ (حضرت) عمر ابن عاصؓ کے بھی لگاؤ کہ اگر اُسے باپ کے اقتدار کا گھمنڈ نہ ہوتا تو وہ ایسی حرکت کبھی نہ کرتا۔ اس کے ساتھ ہی حضرت ابن عاصؓ سے کہا کہ "عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا"۔ کتنا بلیغ ہے یہ مختصر سا فقرہ اور کیسی عظیم حقیقت ہے اس کے اندر پوشیدہ!

اولاد اور خویش و اقارب کی طرف جھکنے کا یہی وہ رجحان تھا جس کی روک تھام کے لئے حضرت عمرؓ اپنے عمال کو تاکید کرتے رہتے تھے کہ

> جو کوئی مسلمانوں کے کسی کام کا مالک ہوا اور پھر اس نے قابلیت کی بجائے اپنی محبت یا قرابت کی بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا، تو اس نے اللہ اور اس کے رسول سے اور مسلمانوں سے غداری کی (سیاست الہیہ۔ امام ابن تیمیہؒ)

قرابت اور محبت کی بنا پر کسی کی طرف جھکنے کا رجحان ہی نہیں، کسی کے منصب وجاہ کے پیش نظر اس سے کسی قسم کی رعایت برتنے کے رجحان پر بھی بڑی کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ اور حضرت اُبی بن کعبؓ کا ایک معاملہ میں اختلاف ہو گیا اور دونوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کو اپنا ثالث مقرر کیا۔ فریقین حضرت زیدؓ کے پاس حاضر ہوئے۔

عدالت میں مساوات

حضرت زیدؓ نے اٹھ کر حضرت عمرؓ کو اپنی جگہ بٹھانا چاہا مگر حضرت عمرؓ حضرت اُبیؓ کے ساتھ بیٹھے رہے۔ حضرت اُبیؓ نے اپنا دعوے پیش کیا اور حضرت عمرؓ نے اس سے انکار کیا۔ قاعدہ کے مطابق حضرت زیدؓ کو حضرت عمرؓ سے قسم لینی چاہیئے تھی مگر انہوں نے قسم لینے میں تامل کیا۔ حضرت عمرؓ نے خود قسم اٹھائی اور مجلس کے خاتمہ پر کہا کہ "زید! تم قاضی بننے کے قابل نہیں ہو سکتے" جب تک تم امیرالمومنین اور ایک مسلمان کو یکساں نہ سمجھو۔ (بیہقی) اسی طرح کا ایک وہ ہے جب ایک یہودی نے حضرت علیؓ کے خلاف حضرت عمرؓ کی عدالت میں دعوے دائر کیا۔ حضرت علیؓ کا جو مقام تھا وہ ظاہر ہے لیکن حضرت عمرؓ نے ان سے کہا،

ابوالحسنؓ! اٹھو اور اپنے مدعی کے ساتھ جا کر بیٹھو

حضرت علیؓ، مدعی کے پاس بیٹھ گئے لیکن کے چہرے پر کچھ ناگواری کا اثر تھا۔ جب مقدمہ ختم ہوا تو حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ کیا اپنے مدعی کے برابر بیٹھنا آپ کو ناگوار گذرا؟ آپ نے کہا کہ نہیں! مجھے یہ بات ناگوار نہیں گذری بلکہ آپ کا انداز تخاطب ناگوار گذرا۔ آپ نے مدعی کا نام لے کر پکارا اور مجھے (ابوالحسنؓ) کنیت سے پکارا جو تعظیم کا پہلو لئے ہے[1]۔ اس طرح آپ نے مدعی میں اور مجھ میں فرق کر دیا مجھے اس عدم مساوات پر ناراضگی ہوئی۔ قانون کی بارگاہ میں شخصیتوں کا کوئی لحاظ نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس باب میں ان حضرات کی نگاہ دور رس کہاں تک جاتی تھی۔

خود حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔ انہوں نے ایک عیسائی کو کوفہ کے بازار میں اپنی گم گشتہ زرہ فروخت کرتے دیکھا۔ آپ نے امیرالمومنین ہونے کی حیثیت سے اس سے زرہ چھین نہیں لی بلکہ قاضی کی عدالت استغاثہ دائر کیا لیکن اپنے دعوے کے ثبوت میں شہادت پیش نہ کر سکے۔ اس لئے قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ دیدیا۔ اور وہ خندہ پیشانی سے واپس آ گئے۔

---

[1] عربوں کے ہاں قاعدہ تھا کہ جس شخص کا احترام مقصود ہوتا اسے نام کے بجائے اس کی کنیت (ابن فلاں یا اب فلاں) سے پکارتے۔ حضرت علیؓ نے اسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

یہ تھا — قانون کی نگاہ میں مساوات کا وہ عظیم اصول جس پر یہ حضرات اس شدت سے کاربند تھے۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، یہ مساوات محض قانون کے احاطے تک ہی محدود نہیں تھی۔ وہ زندگی کے کسی گوشے میں بھی اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے افضل نہیں سمجھتے تھے۔ افضل سمجھنا تو ایک طرف، وہ اپنے آپ کو عام لوگوں سے بھی فروتر مقام پر رکھتے تھے۔ ان کا اصول یہ تھا کہ امیر المومنین کو ضروریات زندگی کی کوئی چیز اپنے لئے اُسوقت لینی چاہیئے جب اسے اطمینان ہو جائے کہ ملت کے ہر فرد کو وہ چیز میسر ہے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ "اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دوسرے انسان بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا والی بننے کے قابل نہیں ہوں۔"

بیت المقدس کا سفر

اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ آپ نے اپنا معیار زندگی انتہائی حد تک سادہ رکھا تھا۔ اس سادگی کی ایک جھلک آپ کے اس سفر میں نظر آجاتی ہے جو آپ نے مدینہ سے بیت المقدس تک کیا تھا۔ وہ ملک ابھی تازہ تازہ فتح ہوا تھا۔ وہاں کے لوگ، بالخصوص عیسائیوں کے مذہبی پیشوا، اپنے نئے حکمرانوں کا "جاہ و جلال" دیکھنا چاہتے تھے۔ تاریخ کے اوراق میں اس "جاہ و جلال" کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

> آپ ایک اونٹ پر سوار تھے جس پر ایک کمبل پڑا ہوا تھا۔ اترتے تو اسی سے بستر کا کام لے لیتے۔ دھوپ ان کی پیشانی پر پڑتی تھی۔ سر پر نہ ٹوپی تھی نہ عمامہ۔ کجاوہ کے دونوں طرف پاؤں بغیر رکاب کے لٹک رہے تھے۔ ساتھ دو تھیلے تھے، ایک میں ستو تھے اور دوسرے میں کھجوریں۔ سامنے پانی کی مشک اور پیچھے توشہ دان۔ جب کھانے کا وقت آتا آپ اپنا توشہ دان پیش کرتے اور سب لوگ آپ کے ساتھ کھانا کھاتے۔ راستہ میں ایک جگہ پانی عبور کرنا پڑا۔ آپ تکلف اونٹ سے اترے۔ موزے اتار کر ہاتھ میں لئے۔ اونٹ کی نکیل پکڑی اور پانی میں گھس گئے۔ سپہ سالار فوج، حضرت ابوعبیدہؓ ساتھ تھے۔ یہ ماجرہ دیکھ کر بولے، امیر المومنین! یہاں کے لوگ آپ کی اس حالت کو دیکھ کر بڑا تعجب کریں گے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سُنکر فرمایا۔ ابوعبیدہؓ۔ کاش یہ بات تمہارے سوا کوئی اور کہتا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم سے زیادہ ذلیل، ہم سے زیادہ حقیر اور ہم سے زیادہ کم تعداد دنیا میں کوئی قوم نہ تھی، لیکن اللہ تعالےٰ نے ہمیں اسلام کے صدقے یہ عزت دی۔ تو یاد رکھو! اگر تم اسلام کی بخشی ہوئی عزت کے سوا کوئی اور عزت حاصل کرنا چاہو گے تو اللہ تمہیں ذلیل کر دے گا۔

بیت المقدس کے قریب پہنچے تو لوگوں کے اصرار پر آپ نے نئے کپڑے بدل لئے سواری کے لئے ایک اسپ تازی منتخب کیا گیا۔ آپ اس پر سوار ہوئے۔ وہ جب اٹھلاتا ہوا چلا تو فوراً اتر پڑے اور ساتھیوں سے فرمایا کہ بھائیو! تم میری لغزش سے درگذر کرو۔ قیامت میں اللہ تمہاری لغزش سے درگذر کرے گا جس نخوت اور تکبّر نے اس وقت میرے دل میں راہ پائی وہ تمہارے امیر کو ضرور ہلاک کر دیتا۔

جب بیت المقدس پہنچے تو آپ کا کھدر کا کرتہ دونوں پہلوؤں سے پھٹ چکا تھا۔ آپ نے لوگوں سے کہا کہ اپنی قوم کے سردار کو بلاؤ۔ جب پادری آیا تو آپ نے اس سے کہا کہ براہ مہربانی میرا ایک ذاتی کام کر دیجئے۔ مجھے ایک کپڑا عاریتاً دیدو اور میری قمیض دھو کر سی دو۔ وہ قمیض دھلوا کر اور پیوند لگوا کر لایا تو آپ نے اپنی قمیض پہن لی اور اس کی قمیض شکریہ کے ساتھ واپس کر دی۔

اور یہ واقعہ بھی اسی جگہ کا ہے کہ آپ وہاں کے سب سے بڑے گرجے میں تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ بطریق نے کہا کہ آپ اسی جگہ نماز پڑھ لیجئے۔ آپ نے معذرت کی اور کہا کہ اگر میں نے آج یہاں نماز پڑھ لی تو مسلمان اسے حجت بنا لیں گے اور ہمیشہ یہیں نماز پڑھیں گے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ عیسائیوں کو گرجے سے نکال باہر کریں گے۔ اس لئے مجھے ایسی طرح نہیں ڈالنی چاہیئے۔ چنانچہ آپ نے گرجے سے باہر کھنڈرات پر ایک جگہ نماز ادا کی۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں بعد میں مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ تعمیر کی تھی۔

بہرحال، یہ ضمنی واقعہ ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ امیر المومنین، اپنا معیار زندگی، عام مسلمانوں سے بھی کمتر درجہ کا رکھتا تھا۔ اور ان کے ادنےٰ ادنےٰ کام خود جا کر کرتا تھا۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو بتایا تھا کہ ان کے امیر المومنین پر کیا حقوق ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ

جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچوں سے دور ہو تو میں ان بچوں کا باپ بنوں ۔

لوگوں کے کام

اور وہ ان کے بچوں کے باپ ہی نہیں بنتے تھے۔ ان کے گھروں میں جا کر خدمتگاروں کے سے کام بھی کرتے تھے۔ مدینہ میں ایک اندھی بڑھیا رہتی تھی جو تنہا رہتی تھی۔ حضرت عمرؓ کا معمول تھا کہ وہ صبح سویرے جاتے اور اس کا ضروری کام کاج کر آتے۔ جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ کوئی شخص ان سے بھی پہلے آ کر اس بڑھیا کا کام کر جاتا ہے۔ آپ نے معلوم کرنا چاہا کہ ایسا شخص کون ہے جو ان پر سبقت لے جاتا ہے۔ ایک دن وہ تاک میں بیٹھے رہے، دیکھا

کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق تاروں کی چھاؤں آئے ہیں اور اس بڑھیا کے ضروری کام نپٹا گئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ یہ کام تو میں کیا کرتا تھا۔ اب آپ نے اسے کیوں شروع کر دیا۔ آپ نے کہا کہ اب یہ کام میری خلافت کی ذمہ داریوں کا حصہ بن گیا ہے۔ لہٰذا یہ مجھے ہی کرنا چاہیئے۔ آپ نے غور فرمایا کہ ان حضرات کے نزدیک خلافت (یعنی حکومت) کی ذمہ داریاں کیا تھیں۔ یہی وہ ذمہ داریاں تھیں جن کی طرف حضرت عمرؓ کی توجہ اس بڑھیا نے دلائی تھی جس سے شام کے سفر سے واپسی پر انکی ملاقات

بڑھیا کی توبیخ

ہوئی تھی۔ اس سفر میں آپ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا اور حسب معمول گشت لگانی شروع کی۔ دیکھا کہ ایک بوسیدہ سے خیمہ میں ایک بڑھیا ہے۔ اس سے جا کر پوچھا اس کا کیا حال ہے۔ اور کسی قسم کی کوئی شکایت تو نہیں۔ اس نے کہا کہ میں تمہیں اپنی شکایت کیا بتاؤں جب کہ اس شخص نے جس کی یہ ذمہ داری ہے آجتک اس کی بابت کبھی پوچھا تک نہیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے جس کی یہ ذمہ داری ہے۔ اس نے کہا کہ وہ جو امیر المومنین بننے کا مدعی ہے۔ آپ نے کہا تم نے اپنی تکلیف کی خبر اس تک پہنچائی تھی۔ اس نے کہا کہ یہ میرا کام نہیں کہ میں اس تک خبر پہنچاؤں۔ یہ اس کا کام ہے کہ رعایا کے ہر فرد کی خبر گیری کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو اسے اس ذمہ داری کو کسی ایسے شخص کے سپرد کر دینا چاہیئے جو اس کا اہل ہو۔

حضرت عمرؓ نے اس واقعہ کو عمر بھر یاد رکھا۔ وہ اسے اکثر دھرایا کرتے تھے اور نم آلود آنکھوں سے کہا کرتے تھے کہ عمرؓ کو اس بڑھیا نے بتایا کہ خلافت کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

میں نے برادرانِ عزیز! شروع میں کہا تھا کہ خدا کی حکومت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ لوگوں سے اطاعت لینے کا حق اسے ہی حاصل ہے جو پہلے خود قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے۔ حاکم بننے کا اہل وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کا محکوم بنا لے۔ جو خدا کا محکوم نہیں، اسے قطعاً حق حکومت حاصل نہیں۔ اور اصل یہ ہے کہ یہاں سوال حق کا نہیں۔ لوگ قوانین کی اطاعت کرتے ہی اسوقت ہیں جب ان کے ارباب حل و عقد خود قانون کی اطاعت کریں۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جسے حضرت عمرؓ نے ان جامع الفاظ میں بیان فرمایا کہ

> عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ نہیں پیدا ہوتی جب تک ان کے پیشوا اور لیڈر سیدھے رہتے ہیں ..... جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔

ان حضرات نے جو خود اس شدت سے قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کی تو اس کا عوام پر غیر شعوری طور پر کیا اثر پڑا، اس کا اندازہ ایک معمولی سے واقعہ سے لگائیے۔ ایک رات حضرت عمرؓ حسب معمول گشت کر رہے تھے کہ ان کا گذر ایک خیمے کے پاس سے ہوا۔ انہوں نے سنا کہ ماں اپنی بچی سے کہہ رہی ہے کہ بیٹی! دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر اسے چولھے پر رکھ دو۔ بچی نے یہ سنکر کہا کہ امی جان! میں دودھ میں پانی نہیں ڈالونگی کیونکہ خلیفہ نے پچھلے خطبہ میں اس کی ممانعت کی تھی۔ ماں نے کہا کہ اس جگہ کونسا خلیفہ دیکھ رہا ہے؟ بچی نے کہا کہ امی! خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم خلیفہ نے پہنچایا تھا!

خداشناس لڑکی

حضرت عمرؓ گھر آئے اور بیوی سے کہا کہ صبح فلاں خیمہ میں جاکر اس بچی کا رشتہ اپنے بیٹے کے لئے مانگ لاؤ۔ جس گھر میں وہ بیٹی آجائیگی وہ گھر خدا کے نور سے بھر جائے گا۔

یہ کردار پیدا کر دیا تھا اس معاشرہ کے بچے اور بچیوں تک میں ان حضرات کی اطاعتِ خداوندی نے!

برادرانِ عزیز! اگرچہ وقت زیادہ ہو رہا ہے لیکن اسی سلسلہ میں ایک واقعہ ایسا سامنے آتا ہے جس کا ذکر کئے بغیر اس داستانِ روح پرور و حریت انگیز کو ختم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ان حضرات کو ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا تھا کہ ان کے صاحب اقتدار ہونے کی وجہ سے نہ کوئی شخص ان سے خوف کھائے اور نہ ہی ان کی بے جا رعایت کرے۔ اس سلسلہ میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے۔ جب حضرت عمرؓ کو آخری زخم لگا اور انہیں یقین ہو گیا کہ ان کی وفات کا وقت قریب آگیا ہے تو انہوں نے اپنے بیٹے کو حضرت عائشہؓ کے پاس بھیجا اس درخواست کے ساتھ کہ انہیں حجرۂ عائشہؓ میں نبی اکرمؐ اور حضرت صدیق اکبرؓ کی معیت میں دفن ہونے کی اجازت دی جائے۔ حضرت عائشہؓ نے اس کی اجازت دیدی۔ حضرت عمرؓ نے تھوڑا توقف فرمایا اور بیٹے سے کہا کہ میرے مرنے کے بعد حضرت عائشہؓ سے ایک مرتبہ پھر دریافت کرنا۔ اگر وہ اجازت دیں تو مجھے وہاں دفن کرنا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس احتیاط میں کس قدر لطیف و نازک احساس کارفرما ہے! آپ نے خیال کیا ہوگا کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے امیر المومنین کی پوزیشن کے مدنظر یہ اجازت دیدی ہو، میرے مرنے کے بعد میری یہ پوزیشن باقی نہیں رہے گی۔ اس لئے اس وقت پھر اجازت لے لینا۔ وہ اجازت ایسی ہوگی جس پر میری موجودہ پوزیشن کسی طرح اثر انداز نہیں ہوگی۔

قبر کے لئے جگہ

یہ ہے، برادرانِ عزیز! اجمالی سا نقشہ، اسلامی حکومت کے فرماں رواؤں کی زندگی اور سیرت کا۔

مساواتِ انسانیہ

دنیا کے کسی نظام حکومت کو لیجئے۔ اس میں سب سے اونچے درجہ کا حاکم، اقتدارِ مطلق (Sovereignty) کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی نظام حکومت چل ہی نہیں سکتا۔ لیکن اسلامی حکومت کا سب سے بڑا فرمانروا بھی اقتدارِ مطلق کا مالک نہیں ہوتا۔ وہ بھی خدا کے احکام و قوانین کا اسی طرح محکوم ہوتا ہے جس طرح اُس مملکت کے دوسرے افراد۔ یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے جس سے اس نظامِ حکومت میں، حاکم اور محکوم کا تصور مٹ جاتا ہے۔ اس میں کوئی حاکم ہوتا ہی نہیں۔ سب خدا کے محکوم اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتے ہیں۔ یہ ہے وہ تصور جس سے حقیقی مساواتِ انسانیہ پیدا ہوتی ہے۔

صلوٰۃ وسلام

لاکھ لاکھ صلوٰۃ وسلام ہو، نوعِ انسان کے اس رہبرِ اعظم پر جس نے اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عملی تربیت سے، دنیا کو بتا دیا کہ ایسا نظامِ حکومت کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے جس میں حاکم اور محکوم میں کوئی امتیاز نہ ہو جس میں فی الحقیقت محمود اور ایاز میں کوئی تفریق نہ ہو۔ مساواتِ انسانیہ کا یہی وہ بنیادی تصور تھا جس کے پیشِ نظر حضور نبی اکرم نے فرمایا تھا کہ دنیا جس قدر جی چاہے اپنے غلط نظام بنا لے۔ ان کے پیدا کردہ طوفانوں۔ زلزلوں اور جھکڑوں کے بعد ایسا نظام پھر سے قائم ہو کر رہے گا جس میں انسانی مساوات کی حسین جنت، وجہ احترامِ آدمیت ہو گی۔ اس نظام کی خصوصیت یہ ہو گی کہ یقسم المال صحاحاً۔ اس میں مال و دولت کی تقسیم صحیح پیمانوں کے مطابق ہو گی۔ جب پوچھا گیا کہ "صحیح تقسیم" کا معیار کیا ہو گا تو آپ نے فرمایا کہ بالسویۃ بین الناس۔ تمام انسانوں میں مساوی تقسیم[1] اس میں فرماں روا کا حصہ، فرماں پذیر سے زیادہ نہیں ہو گا۔ اور یہی ہے نبی اکرم کا وہ اسوۂ حسنہ جو ساری دنیا کے لئے دعوتِ انقلاب اور نشیدِ حیات ہے۔ دنیا کی جس سعادت مند قوم نے بھی اپنے آپ کو اس سانچہ میں ڈھال لیا وہ نوعِ انسان کی امامتِ کبریٰ کی مستحق قرار پا جائے گی۔ اور اس کا ایک ایک فرد، بارگاہِ رسالتمآب میں پکار پکار کر کہے گا کہ۔

منزل ملی۔ مقام ملا۔ مدعا ملا۔
سب کچھ مجھے ملا جو ترا نقشِ پا ملا۔

والسلام

---

[1] مجمع الزوائد۔ نیز ترمذی۔

قربانی اور صحابہ کبارؓ

(محترم رفیع اللہ حسان صاحب)

دور رسالت کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا زمانہ ہماری تاریخ کا وہ درخشندہ زمانہ ہے جس کی چمک بعد کے ہر دور کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان برگزیدہ ہستیوں کی اکثریت نے دامن نبوت میں تربیت حاصل کی تھی اور اسلامی احکام کی تعبیر و تفسیر خود حضور صلعم کی زبانی سُنی تھی۔ اس لئے اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کا عمل قرآن مجید کے منشاء کے مطابق تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ ان پاکیزہ ہستیوں کا صحیح عمل بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا گیا۔ اور رفتہ رفتہ تقلید کے زور دروں کی وجہ سے ہماری حالت اس حد تک پہنچ گئی کہ ہم نے ان کا اصل مسلک معلوم کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ اس حقیقت کا اندازہ صرف ایک مسئلہ قربانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا عمل کیا تھا اور ہم کہاں بھٹک رہے ہیں۔

قربانی کا اصل مقصد

اس باسعادت دور میں قربانی کا مقصد بالکل وہی تھا جو قرآن مجید سے متعین ہوتا ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ حجاج کرام راستہ میں ان جانوروں سے فائدہ اٹھائیں اور جب مکہ شریف پہنچ جائیں تو انہیں ذبح کر کے خود بھی کھائیں اور دوسرے ضرورتمندوں کو بھی کھلائیں جیسا کہ سورۃ حج میں ہے :-

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ - الحج - ۳۳

ترجمہ :- تمہارے لئے ان چارپاؤں میں فائدے ہیں ایک مقررہ وقت تک پھر انہیں کعبہ شریف تک پہنچانا ہے۔ اور اس کے بعد

فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ - الحج - ۲۸

انہیں خود بھی کھاؤ اور بھوکے ضرورت مندوں کو بھی کھلاؤ۔

حضرت عمرؓ کا مسلک

حضرت عمرؓ کا مسلک بالکل اس کے مطابق تھا۔ وہ تو یہ بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ ہر حاجی لازماً جانور ذبح کرے۔ بلکہ استنے جانوروں کا ذبح کیا جانا کافی سمجھا جاتا

تھا جس سے حاجیوں کی ضروریات پوری ہو جائیں۔

عن ابراہیم وکان عمر یحج ولا یضحی وکان اصحابنا یحجون معھم الورق والذھب فلا یضحون[1]

ترجمہ :- جناب ابراہیم سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ حج ادا کرتے تھے لیکن وہاں قربانی نہیں کرتے تھے۔ اس طرح ہمارے بہت سے رفقا جو فریضۂ حج ادا کرتے تھے لیکن سونا چاندی ہونے کے باوجود بھی قربانی نہیں کرتے تھے۔

یہ تو اس قربانی کا ذکر ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ جہاں تک مکہ شریف کے علاوہ دوسری جگہوں پر قربانی کا تعلق ہے اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ کا مسلک امت کے لئے باعث خیر و برکت ہے بشرطیکہ اس پر عمل کیا جائے۔ امام شافعیؒ خلفاء راشدین کا عمل ان الفاظ میں نقل فرماتے ہیں۔

قد بلغنا ان ابابکر و عمر کانا لا یضحیان کراھیۃ ان یقتدی بھما لیظن من راھما انھا واجبۃ[2]

حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ اس خدشہ سے قربانی نہیں کرتے تھے کہ کہیں لوگ ان کی پیروی میں اسے ضروری نہ سمجھ لیں۔

یہ صحیح روایت اتنی مشہور کہ اکثر معتبر دینی کتب میں پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود امت مسلمہ کو اس سے بے خبر رکھا گیا ہے اور ابھی بے خبر رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ امام ابن حزم نے حضرت حذیفہ سے یہی روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے

عن ابی سریحۃ حذیفۃ بن اسید الغفاری۔ قال لقد رایت ابابکر و عمر ما یضحیان کراھۃ ان یقتدی بھما۔[3]

ترجمہ :- حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ یہ میری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اس کراہت کی وجہ سے قربانی نہیں کرتے تھے کہ کہیں ان کی پیروی میں لوگ اسے ضروری نہ سمجھ لیں۔

دولت مندی کے باوجود قربانی نہیں کی جاتی تھی

جیسا کہ اوپر جناب ابراہیم کی روایت سے معلوم ہو چکا ہے قربانی ترک کرنے کا سبب ان حضرات کی مفلسی نہیں تھی۔ بلکہ حجاج کے پاس تو ہزاروں کی تعداد میں جانور موجود ہوتے تھے اور وہ جان بوجھ کر قربانی نہیں کرتے تھے۔

---

[1] المحلی لابن حزم جلد ۷ صفحہ ۳۵۵ [2] کتاب الام جلد ۲ صفحہ ۱۸۹

[3] المحلی لابن حزم جلد ۷ صفحہ ۳۵۵

شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں:-

وقال ابو مسعود الانصاری تقدرا علی الف شاۃ وجرام فلا اضحی مخافۃ ان یراھا الناس واجبۃً ؎۱

ترجمہ:- حضرت ابومسعود انصاری نے فرمایا کہ میں ایک ہزار بکریوں کا مالک ہونے کے باوجود اس خوف سے قربانی نہیں کرتا کہ کہیں لوگ اسے ضروری نہ سمجھ لیں۔

قربانی کے دن بازار میں گوشت بکتا تھا

اس کے برعکس اس عید کے دن بازاروں میں با فراط گوشت بکتا تھا اور صحابہ کرامؓ اپنی ضروریات کے لئے بازار سے گوشت خریدتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت ابن عباسؓ سے قربانی کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے اپنے نقطۂ نظر کو عمل سے سمجھانے کے لئے عکرمہ کو دو درہم دیکر بازار سے گوشت خرید لانے کے لئے بھیجا اور ساتھ ہی یہ تاکید کردی کہ راستہ میں ہر ملنے والے سے کہہ دینا کہ بس یہی ابن عباس کی طرف سے قربانی ہے۔

اصل عربی عبارت ملاحظہ ہو۔

قال عکرمۃ بعثنی ابن عباس بدرھمین اشتری بھما لحماً وقال من لقیت فقل لہ ھذہ اضحیۃ ابن عباس ؎۲

عید ہی منانی تھی تو اس کے لئے مرغ بھی ذبح کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ صحابہؓ اس پر بھی عمل کرتے تھے۔ بلکہ اکثر حالات میں تو وہ قربانی کی رقم سے کسی ضرورت مند کی حاجت روائی کو زیادہ مستحسن سمجھتے تھے۔ حضرت بلالؓ کا یہی مسلک تھا۔

عن سعید بن غفلۃ قال قال لی بلالٌ ما کنتُ ابالی لو ضحیتُ بدیکٍ ولأن اخذ الثمن الاضحیۃ فاتصدق بہ علی مسکینٍ مقتَرٍ فھو احبُّ الیّ من ان اضحی ؎۳

ترجمہ:- حضرت سعید بن غفلۃ سے روایت ہے کہ حضرت بلالؓ نے ان سے فرمایا کہ وہ اس امر کی پرواہ نہیں کرتے کہ وہ قربانی کے لئے مرغ ذبح کریں۔ بلکہ قربانی کی قیمت لے کر کسی حاجتمند پر خرچ کردینا ان کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔

مرغ کی قربانی

مرغ کی قربانی کوئی نظریاتی بات نہیں تھی بلکہ حضرت بلالؓ کا تو عمل ہی اسی پر تھا وروی عن بلالؓ انہ ضحی بدیکٍ ؎۴

؎۱ المبسوط جلد ۱۲ صفحہ ۸ ؎۲ بدایۃ المجتہد جلد ۱ صفحہ ۴۱۶ ؎۳ المحلی لابن حزم جلد ۷ صفحہ ۳۵۸
؎۴ بدایۃ المجتہد جلد ۱ صفحہ ۴۱۶

حضرت بلالؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے مرغ کی قربانی دی

پرندوں کی قربانی دینی بھی جائز ہے

صحابہ کے اس عمل کے پیش نظر ائمہ مجتہدین نے پرندوں کی قربانی بھی جائز قرار دیا ہے! علامہ ابن حزم فرماتے ہیں۔

والاضحیة جائزة بکل حیوان یوکل لحمہ من ذی اربع او طائر کالفرس والابل و بقر الوحش والدیک و سائر الطیور والحیوان الحلال اکلہ۔ [1]

ہر حیوان جس کا گوشت کھایا جاتا ہے کی قربانی جائز ہے چاہے چار پائے ہوں یا پرندے۔ مثلاً گھوڑا، اونٹ، جنگلی گائے، مرغ اور دوسرے تمام پرندے اور حیوان جن کا گوشت کھانا حلال ہے۔

قربانی کے عدم وجوب پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے

اگر مسائل دینیہ میں تو بعض صحابہ کرامؓ کے ایسے اقوال مل جاتے ہیں جن کو صاحب مطلب لوگ اپنی تائید میں پیش کر دیتے ہیں لیکن اس مسئلے میں تو ایسا کوئی قول یا عمل بھی نہیں ملتا بلکہ امام ابن حزم کی تحقیق تو یہ ہے کہ اس کے غیر واجب ہونے پر صحابہ کا اجماع ہے۔

لا یصح عن احد من الصحابة ان الاضحیة واجبة وصح ان الاضحیة لیست واجبة۔ عن سعید بن المسیب والشعبی انہ قال لان اتصدق بثلاثة دراھم احب الی من ان اضحی [2]

ترجمہ: قربانی کا وجوب کسی صحابی سے ثابت نہیں اور صحیح مسلک بھی یہی ہے کہ قربانی غیر واجب ہے اور اور سعید بن المسیب اور الشعبی سے بھی یہی روایت ہے اور انہوں نے فرمایا کہ قربانی کی بجائے تین درہم خیرات کر دینا ان کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔

قربانی کے متعلق صحابہ کرامؓ کا یہ مسلک کتنا واضح اور روشن ہے جس سے عامۃ الناس کو بے خبر رکھا گیا ہے۔ اس کے برعکس جب یہ دعوےٰ کیا جائے کہ قربانی کے وجوب پر امت کا اجماع ہے [3] تو ایسے حضرات کے علم یا دیانت کے متعلق قارئین خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔

طلوع اسلام

دین میں اتحاد دیتی تیز صورت یہ ہوتی ہے کہ بعض ایسی اصطلاحات رائج ہو جاتی ہیں جن کا تعلق نہیں ہوتا لیکن وہ رفتہ رفتہ دینی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ انہی اصطلاحات میں ایک لفظ "قربان" کا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ صرف دو مرتبہ آیا ہے، ایک سورۃ مائدہ میں جہاں "آدم کے دو بیٹوں کا قصہ مذکور ہے جن کے متعلق کہا ہے

---

[1] المحلی جلد ۷ صفحہ ۳۷۰ [2] ایضاً صفحہ ۳۵۸ [3] ماہنامہ میثاق ستمبر ۱۹۶۴ صفحہ ۸۴

کہ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا (۵/۲۷) شاہ رفیع الدینؒ اور مولانا محمود الحسنؒ (دونوں) نے اس کا ترجمہ "نیاز" کیا ہے۔ دوسری جگہ یہ لفظ سورۃ آلِ عمران میں آیا ہے جہاں یہودیوں کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ سے کہتے تھے کہ ہم آپؐ پر ایمان نہیں لائیں گے حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُهُ النَّارُ (۳/۱۸۳) یہاں اس کا ترجمہ "قربان" کیا گیا ہے اور چونکہ تورات میں ہے کہ یہودی قربان میں جانور ذبح کیا کرتے تھے اس لئے اس کے معنی بطور قربان جانوروں کا ذبح کرنا لئے گئے ہیں ان کے ذبح کئے جانے ہی کا ذکر آیا ہے۔ (۲۲/۳۴-۳۶-۳۷)۔

۲۔ بڑی عید کو عِیْدُ الْاَضْحٰی اور دسویں ذی الحج کو یَوْمُ الْاَضْحٰی کہا جاتا ہے۔ یہ ضُحیٰ سے ہے جس کے معنی اُس وقت کے ہیں جب دھوپ چڑھ آئے۔ جو کام بھی ایسے وقت میں کیا جاتا تھا اس کے لئے یہ لفظ بولتے تھے۔ چنانچہ اُضْحِيَّةٌ اُس جانور کو کہتے تھے جسے دھوپ چڑھے ذبح کیا جائے۔ یہیں سے یَوْمُ الْاَضْحٰی ہے۔ یعنی وہ دن جب دھوپ چڑھے جانور ذبح کئے جائیں۔

جو جانور حج میں ذبح کئے جاتے ہیں ان کے لئے یہ لفظ بھی قرآن کریم میں نہیں آیا۔ (جو جانور عید کے دن دنیا کے دیگر مقامات میں ذبح کئے جاتے ہیں ان کا تو ذکر تک قرآن کریم میں نہیں)۔

۳۔ اب ظاہر ہے کہ جو جانور حج کے موقعہ پر ذبح کئے جاتے ہیں، اگر ان سے مقصود "قربانی" ہوتا (یعنی وہ قربانی جس کا تصور اور عمل اسلام سے پہلے لوگوں میں رائج تھا) تو قرآن میں ان کے لئے "قربان" کا لفظ آتا۔ اس لئے اس لفظ کو یہودیوں کی "قربان" کے لئے تو استعمال کیا ہے۔ لیکن جو جانور حج کے موقعہ پر ذبح کئے جاتے ہیں ان کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس نے ان جانوروں کے متعلق اتنا ہی کہا ہے کہ وہ تمہارے کھانے کے لئے ہیں۔ انہیں تم خود بھی کھاؤ اور دوسرے حاجتمندوں کو بھی کھلاؤ۔ ان جانوروں کے لئے "قربان" کا لفظ، درج از قرآن اصطلاح ہے اور یہی وہ لفظ ہے جس نے ان جانوروں کو ان جانوروں سے تمیز اور ممتاز کر دیا ہے جنہیں کھانے کے لئے ذبح کیا جاتا ہے۔ اگر ان کے لئے یہ اصطلاح استعمال نہ کی جاتی اور جو کچھ قرآن کریم نے کہا ہے اسے سیدھے سادے طریق پر سمجھ لیا جاتا، تو نہ "قربان" کا موجودہ تصور پیدا ہوتا۔ اور نہ ہی وہ اس سلسلہ میں بحثیں پیدا ہوتیں جن میں اُمت اُلجھے چلی آ رہی ہے۔

یاد رکھئے! قرآن کریم میں حج کے موقعہ پر کھانے پینے کے سلسلہ میں جانور ذبح کرنے کا ذکر ہے "قربان" کا کہیں ذکر نہیں۔ اس لئے ان کے لئے یہ لفظ ہی غیر قرآن ہے۔ بعض لوگ نُسُک یا نحر کا ترجمہ بھی "قربان" کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ امر بھی بحث طلب ہے کہ ان الفاظ کا یہ ترجمہ درست ہے یا نہیں لیکن حج کے موقعہ پر جانور ذبح کرنے کا جو ذکر قرآن کریم میں آیا ہے اس سلسلہ میں یہ الفاظ بھی استعمال نہیں ہوئے لہٰذا انکے لئے از روئے قرآن کسی قرینہ سے بھی "قربانی" کا تصور سامنے نہیں آتا۔

——— ・ ———

رابطہ باہمی

بزمہائے طلوع اسلام کی ماہانہ رپورٹیں

لاہور | بزم کے ارکان پورے ربط و ضبط، جوش و خروش اور کامل ہم آہنگی سے ایک ٹیم کی طرح قرآن کی دعوت فکر کو عام کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔ لٹریچر کی تقسیم منظم طور پر جاری ہے۔ اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ طلوع اسلام کالج کے لیے بھی سرگرمی اور باہمی تعاون سے جدوجہد کا سلسلہ قائم ہے۔

اس دفعہ یوم جشن میلاد النبیؐ کی تقریب سعید کو شایان شان طور پر منانے کا اہتمام کیا گیا۔ اس سلسلے میں ۱۶۔ جولائی کو نماز مغرب کے بعد وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ایک شاندار جلسۂ عام ہوا۔ جس سے محترم پرویز صاحب نے خطاب کیا۔ راجہ محمد اکرم صاحب ایڈووکیٹ نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ محترم عبداللطیف صاحب نظامی نے قرآن کریم کی آیات اور ان کے مفہوم سے اجلاس کی کارروائی کا آغاز کیا۔ مرزا محمد خلیل صاحب نے کلام اقبال سے بارگاہ حضور رسالتمآبؐ میں نذر عقیدت پیش کی۔ صدر محترم کے تعارفی خطاب کے بعد پرویز صاحب سٹیج پر تشریف لائے۔ ان کے خطاب کا عنوان تھا۔

اسلامی حکومت کسے کہتے ہیں

بالفاظ دگر یہی موضوع حضور نبی اکرمؐ والذین معہٗ کی اس پوری جدوجہد کو اپنے دامن میں سمٹائے ہوئے تھا جو قرن اول میں اسلامی نظام کے جیتے جاگتے پیکروں میں متشکل ہوئی۔ قرآن کریم کی صورت میں حضورؐ نوع انسانی کے لئے وہ ضابطۂ حیات لے کر آئے تھے جسے قیامت تک کے لئے انسانی زندگی کی خوش نصیبیوں کا سرچشمہ بننا مقصود تھا۔ حضور نبی اکرمؐ نے کس حسن کارانہ انداز سے اس نظام کے قرآنی اصول و اقدار کو عملاً متشکل کیا؟ اس کے لئے آپ نے کیا کچھ جدوجہد کی؟ حضورؐ کے بعد آپ کے جانشینوں نے اس نقشے کو کس طرح کامیابی سے آگے بڑھایا؟ اور اس کے نتیجے میں نوع انسانی کو کس جنت ارضی کی بہار آفرینیوں سے مالا مال ہونے کے مواقع نصیب ہوئے؟ پرویز صاحب کا بصیرت افروز

اور وجد آفریں خطاب اسی اجمال کی تفصیل تھا۔ مفکر قرآن نے قرآن کے ایک طالب علم اور تاریخ کے ایک حقیقت پسند محقق کی حیثیت سے اس دورِ ہمایونی کی "تاریخ کے اوراق کو الٹنا شروع کیا۔ اور رطب و یابس کا دامن جھٹکتے ہوئے عہد نبوت و خلافت راشدہ کے ان اُجلے اُجلے نقوش کو قرآن کریم کے آئینے میں پیش کرتے چلے گئے جن کی بدولت "تاریخ انسانی کا وہ سعادت آفریں باب تکمیل پایا جو ہمیشہ اپنی مثال آپ رہے گا۔ مفکر قرآن کی آواز سوز و گداز اور جذب و مستی کے والہانہ انداز میں لبوں سے اُبھر اُبھر کر فضا میں مرتعش ہو رہی تھی۔ حیاتِ مقدسہ کے حقیقت کش گوشے شادابیٔ قلب و نگاہ کا سامان بن رہے تھے۔ خلافت راشدہ کا چمن زار اپنے گلہائے رنگا رنگ سے نور و نکہت کا سماں باندھ رہا تھا۔ اور تاریخ کی یہ عظیم حقیقت اُبھر اور نکھر کر منظرِ عام پر آ رہی تھی کہ جب قرآن کریم کے عطا فرمودہ اصول و اقدار محسوس و مشہود پیکروں میں ڈھل کر ایک جیتے جاگتے نظام معاشرہ میں متشکل ہوتے ہیں تو انسانی زندگی میں کیونکر جنت ارضی کی بساط بچھ جاتی ہے۔

سیرۃ طیبہ کے موضوع پر پورے ملک اور پورے لاہور میں میلاد کی مجلسوں کا ایک سلسلہ دراز قائم ہے۔ ملک کا کوئی گوشہ ان مجالس سے محروم نہیں۔ لیکن ۱۲ رجولائی کی شب کو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں مفکر قرآن کی زبانی حضور رسالتمآب وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کے سعادت آفریں دور کا جو حقیقت کشا نقشہ سامعین کے قلب و نگاہ کو چکا چوند کر رہا تھا۔ وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس کا اپنا ایک منفرد انداز تھا۔

جشن میلاد کی سالانہ مجلس

۱۰۔ جولائی کی شب کو، سالہائے ماسبق کی طرح، مفکر قرآن کا دولتکدہ رنگا رنگ کے برقی قمقموں سے بقعہ نور دکھائی دے رہا تھا۔ بزم لاہور کے ارکان صبح سے ہی سرگرم تگ و تاز نظر آ رہے تھے۔ یہ سب کچھ اس مجلس کا حسن آغاز تھا جو ہر سال جشن میلاد کی تقریب سعید کے سلسلے میں بزم لاہور کے زیر اہتمام منعقد ہوتی ہے۔ اور وجد و کیفیت کی ایک نئی دنیا آباد کر کے رات ڈھلے لیئے حاصل اتمام کو پہنچ جاتی ہے۔ حسب سابق اس بار بھی اس تقریب کے لئے اراکین بزم نے دل کھول کر اس کی کامیابی میں حصہ لیا اور پہلے سے بڑھ چڑھ کر انتظامات کی صورت پیدا کی۔ آٹھ بجے شب سے قبل ہی مہمانوں کی آمد آمد شروع ہو گئی۔ ان میں بزم لاہور کے ارکان بھی تھے۔ پرویز صاحب کی طاہرہ بہنیں اور بیٹیاں بھی شریک تھیں اور لاہور کے صاحب ذوق احباب کے علاوہ بیرون لاہور کے رفقائے سفر بھی۔ آٹھ بجے شب اس مبارک تقریب کے شایان شان عشائیہ کا انتظام تھا،

اور اس کے بعد نو بجے وہ محفل آراستہ ہوگئی جو کلام اقبالؒ سے نوازی گئی۔ محترم نذیر احمد فاروقی جیسا سخن آتش نفس اس محفل کی رونق تھا۔ فاروقی صاحب کا شعر کا انتخاب بھی قابل داد ہوتا ہے۔ فارسی۔ اردو۔ پنجابی کوئی بھی زبان ہو، وہ جو کچھ پیش کرتے ہیں کیا مجال جو اس میں ایک لفظ بھی پایۂ ثقاہت سے گرا ہوا ہو۔ رات ڈھلے تک ان کے پر کیف نغمے اس مجلس کی سہانی فضا میں جذب و مستی کا سرور بکھیرتے رہے۔

کراچی یہاں کی بزم پورے عزم اور ولولے سے کام کر رہی ہے۔ پرویز صاحب کے درس قرآن کریم کا سلسلہ سندھ اسمبلی ہال میں باقاعدگی سے جاری ہے۔ جہاں لٹریچر کی تقسیم اور ادارہ کی مطبوعات کی فروخت کا باضابطہ انتظام کیا جاتا ہے۔ کالج فنڈ کی فراہمی کے سلسلے میں بزم کے ارکان پورے جوش و خروش سے کام کر رہے ہیں۔ ۱۸۔ جولائی کو جشن میلاد النبیؐ کی تقریب سعید منانے کا اہتمام کیا گیا جس میں امید سے بڑھ کر حاضری تھی۔ اس موقع پر تحریک طلوع اسلام کے مسلک و مقصد کا بھی تعارف کرایا گیا۔ اور لٹریچر کی تقسیم بھی عمل میں آئی۔

۲۵ جولائی کی خصوصی تقریب

کم و بیش سات سال قبل لاہور میں مفکر قرآن کے درس قرآن کریم کے جس سفر کا آغاز ہوا تھا، ۱۸۔ جولائی کو اس کا نصف اول حسن و خوبی سے تکمیل پا گیا۔ یعنی محترم پرویز صاحب اس روز اپنے ہفتہ واری سلسلۂ درس میں پندرھویں پارے کے اختتام کو پہنچ گئے۔ یہ بڑا خوش کن مقام تھا۔ جس پر احباب نے جشن مسرت کے طور پر آئندہ اتوار کو ایک خصوصی مجلس کے انعقاد کا فیصلہ کیا، تاکہ اس باسعادت سفر کی نصف منزل کے اس حسن و خوبی سے ختم ہونے پر بدرگاہ رب العزت سجدۂ تشکرانہ پیش کیا جائے۔ اس سلسلے میں نمائندگان بزمہائے طلوع اسلام کے نام بھی ایک دعوتی سرکلر جاری کیا جا رہا ہے تاکہ اگر باہر کے اراکین بزم چاہیں تو وہ بھی اس یادگار تقریب میں شرکت کر سکیں۔ اس تقریب کی روئیداد طلوع اسلام کی آئندہ اشاعت میں ہی پیش کی جا سکے گی۔

صفت: مجرب دوا برائے دمہ۔ درد گردہ۔ پتھری
ملنے کا پتہ: حاجی محمد دین سیٹھ آئس فیکٹری متصل گنیش کھوپرا ملز لارنس روڈ کراچی۔
نوٹ: جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

باب المراسلات

تعبیر کا اختلاف

سوال:۔ آپ کہتے ہیں کہ قانون سازی کے سلسلہ میں اگر قرآن مجید کو بنیادی سند قرار دیدیا جائے تو موجودہ اختلافات بھی مٹ سکتے ہیں اور ایک ایسا ضابطۂ قوانین بھی مدون ہو سکتا ہے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو سکتا ہے۔ لیکن مولوی صاحبان اس کے خلاف یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی تعبیر میں خود اختلاف ہے۔ اس سے اختلافات کس طرح سے مٹ سکیں گے اور ایک متفق علیہ ضابطہ کس طرح مرتب ہو سکے گا؟ کیا آپ اس کی وضاحت فرمائیں گے؟۔

جواب:۔ ہمارے مولوی صاحبان کی تو حالت ہی عجیب ہے۔ قرآن کریم کے متعلق جب ان سے وعظ سنو تو یہ بتائیں گے کہ خدا کی یہ آخری کتاب بے مثل و بے نظیر ہے۔ دنیا بھر کے انسان مل کر اس کی مانند کوئی کتاب نہیں بنا سکتے۔ یہ اس کتاب عظیم کا معجزہ ہے جس کے سامنے عرب بھی سرنگوں تھے اور آج تک کوئی اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکا۔ اور نہ ہی کر سکے گا۔

لیکن جب ان سے اس کتاب کو ضابطۂ شریعت بنانے کے متعلق کہا جائے تو یہ دنیا بھر کے نقائص اس کتاب میں گنانے چلے جائیں گے ـــ یہ نامکمل ہے۔ اس میں احکام دیئے گئے ہیں۔ لیکن ان کی عملی تفصیل کہیں نہیں دی گئی۔ یہ غیر واضح اور مبہم ہے۔ یہ اپنا مطلب واضح طور پر بیان نہیں کر سکتی۔ اس میں تضادات ہیں جن کے رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بعض آیات کو ناسخ مانا جاتا ہے اور بعض کو منسوخ۔ لیکن اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ اس کی کونسی آیات ناسخ ہیں اور کونسی منسوخ۔ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو قرآن کے اندر موجود نہیں۔ لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ اس کی مختلف "قراتیں" ہیں۔ یعنی ایک آیت قرآن کریم میں کسی طرح لکھی ہوئی ہے اور بعض صحابہؓ اسے کسی اور طرح پڑھتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

آپ غور کیجئے کہ جتنے نقائص یہ اس کتاب میں بیان فرماتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک نقص بھی ان کی اپنی

کتاب میں دکھایا جائے تو یہ اس شخص کے گلے پڑ جائیں اور کبھی ماننے کے لئے تیار نہ ہوں کہ اس میں ایسا نقص موجود ہے۔ اب ان نقائص کی فہرست میں ایک اور اضافہ بھی ہو گیا ہے اور وہ یہ کہ اس کی آیات کے الفاظ تو اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ لیکن ان کی تعبیر (INTER PRETATION) میں اختلاف ہے۔ اس لئے ان کا کوئی متفق علیہ مفہوم نہیں لیا جا سکتا لہٰذا یہ مسلمانوں کا ضابطہ قوانین بن سکنے کے قابل نہیں۔

قرآن کریم میں احکام بھی ہیں اور حقائق بھی۔ تاریخی نظائر بھی ہیں اور علمی دلائل بھی۔ قانون سازی کے سلسلہ میں چونکہ معاملہ احکام سے متعلق ہوتا ہے۔ اس لئے ہم بنیادی طور پر اس کے اسی حصہ کو لیتے ہیں۔ جہاں تک احکام کا تعلق ہے قرآن کریم میں بعض احکام متعین قانون کی شکل میں دیئے گئے ہیں (مثلاً حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ ۴/۲۳) اور بعض اصول کی شکل میں (مثلاً اِعْدِلُوْا۔ ۵/۸) جہاں تک متعین احکام کا تعلق ہے ان میں کسی تعبیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ احکام واضح، متعین اور محکم ہیں۔ مثلاً جو مثال ہم نے اوپر پیش کی ہے کہ — تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں — ذرا سوچئے کہ اس میں دو تعبیریں ممکن ہیں؟ اس میں ایک ہی سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ "ماؤں" میں سوتیلی مائیں بھی شامل ہیں یا نہیں۔ تو اس کی وضاحت قرآن کریم نے یہ کہہ کر کر دی کہ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۲۲) ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ کر چکے ہیں۔ بات واضح ہو گئی کہ حقیقی اور سوتیلی دونوں مائیں حرام ہیں۔ حتیٰ کہ رضاعی مائیں بھی (۴/۲۳)

جہاں تک اصول احکام کا تعلق ہے وہ بھی اپنے مفہوم کے اعتبار سے واضح اور دو ٹوک ہیں۔ انہیں اصولی طور پر بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانے کے مقتضیات کی روشنی میں تفصیلی احکام خود مدوّن کرے۔ قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے اور ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے جو جزئی احکام مرتب کئے جائیں گے ان میں حالات کے تقاضے کے مطابق رد و بدل ہو سکے گا۔ مثلاً "عدل کرو" ایک اصولی حکم ہے۔ عدل کسے کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت مختلف مقامات پر خود قرآن نے کر دی ہے۔ لیکن یہ امور کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں عدل کی شکل کیا ہو گی۔ عدل کرنے کی عملی صورتیں کیا ہوں گی کس مقام پر کہا جائے گا کہ یہ فیصلہ عدل کے مطابق نہیں وغیرہ وغیرہ) اسلامی نظام مملکت کے طے کرنے کے ہوں گے۔ اسی طرح یہ فریضہ بھی اسلامی مملکت کا ہو گا کہ قرآن میں جو اصطلاحات آئی ہیں ان کا منطوق ———— متعین کیا جائے۔ مثلاً قرآن میں الخمر کی ممانعت آئی ہے۔ اس اصطلاح کا اطلاق کون کونسی چیزوں پر ہو گا اور کن کن حالات میں اس کا تعین بھی نظام مملکت کرے گا۔ اسی طرح قرآن کریم کے متعین احکام کی روشنی میں ان سے ملتے جلتے حالات کے لئے قوانین کی تدوین بھی اسی مملکت کی ذمہ داری ہو گی۔

قرآن کریم نے امور مملکت کے سلسلے میں مشاورت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس مشاورت کی مشینری کی کیا شکل

ہوگی اس کا تعین بھی اس نے مملکت پر چھوڑ دیا ہے۔ مشورہ دیتے وقت مختلف ارباب فکر و نظر کی آراء مختلف ہو سکتی ہیں۔ لیکن جب اس کے بعد مملکت کسی فیصلہ پر پہنچ کر قانون نافذ کر دے گی تو اس کی اطاعت سب پر لازم آ جائے گی۔ ہاں! اگر کوئی شخص اس میں کوئی ترمیم چاہے گا تو اس کے لئے اسے وہی طریق کار اختیار کرنا ہوگا جو اس مقصد کے لئے نظامِ مملکت نے طے کیا ہو۔

غور کیجئے کہ مولوی صاحبان جس چیز کو تعبیر کے اختلافات کا ہوا بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اسلامی نظامِ مملکت میں اسکا کوئی وجود بھی ہے؟ یہ اختلافات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب نظامِ مملکت موجود نہ ہو اور تعبیر کا حق ہر ایک کو انفرادی طور پر دیدیا جائے۔ ہمارے مولوی صاحبان کے ذہن میں نظام کا تصور ہی نہیں۔ ان کے نزدیک اسلام انفرادی زندگی نام ہے اور انفرادی زندگی میں ــــ قوانین تو بہت بڑی چیز ہیں ــــ یہ بھی طے نہیں ہو سکتا کہ نماز میں آمین اونچی آواز سے کہنی چاہئے یا نیچی آواز سے ــــ اس لئے یہ سمجھ سکنا ان کے بس کی بات نہیں کہ ایک نظام کے تابع اختلافات کس طرح مٹ جایا کرتے ہیں۔ ان کی یہی بے بسی تھی جس کے لئے اقبال نے کہا تھا کہ

قوم کیا چیز ہے۔ قوموں کی امامت کیا ہے ۔۔۔ اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

ان کی بے بسی کا یہ عالم اور ہماری سادہ لوحی کی یہ کیفیت کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے بغیر اسلامی ضابطہ قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکتا ــــ نتیجہ ظاہر ہے!

باقی رہے خود حقائق جنہیں قرآن کریم نے تشبیہی انداز سے بیان کیا ہے (جنہیں متشابہات کہکر پکارتا ہے) سو ان کا سمجھنا انسان کی علمی سطح کی نسبت سے ہے۔ (مثلاً کَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ۔ خدا کا عرش پانی پر ہے) انسان کی علمی سطح مختلف ادوار میں مختلف ہو سکتی ہے ــــ اور جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے یہ سطح بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہے اس لئے ان تشبیہی حقائق کے متعلق مختلف ادوار میں مختلف تعبیرات ہو سکتی ہیں۔ نیز کسی ایک دور میں بھی، مختلف افراد کی علمی سطح کے مطابق مختلف۔ لیکن ان کے متعلق تعبیرات کے اختلاف سے نہ ان کی عملی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ نہ اجتماعی نظام اور ضابطہ قوانین پر۔ اس کے لئے صرف اتنی احتیاط کی ضرورت ہے کہ کوئی تعبیر قرآن کے کسی اصول سے نہ ٹکرائے لیکن اس باب میں ہمارے مولوی صاحبان کا مسلک یہ ہے کہ ان حقائق کے متعلق، جو کچھ متقدمین نے لکھ دیا ہو وہی حق و صداقت ہے اور اس سے اختلاف، کفر و الحاد۔ یہ مسلک قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے جو انسانوں کو تدبر و تفکر کی شدت سے تاکید کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ حکم، نہ تو کسی خاص دور کے انسانوں تک محدود ہو سکتا ہے نہ کسی خاص گروہ کے اندر منحصر۔ نہ ہی اس باب میں کسی فرد کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے تدبر کے نتیجہ کو حرفِ آخر قرار دے کر اسے کفر و ایمان کا معیار ٹھہرائے۔

۲- احادیث میں جنت کی تفصیل

سوال :- قرآن شریف میں جنت کی بعض تفاصیل کا ذکر ہے۔ کیا حدیثوں میں بھی جنت کا ذکر آیا ہے۔ اس کی تفاصیل کیا ہیں۔

جواب :- احادیث میں جنت کی بڑی تفاصیل دی گئی ہیں۔ ان سب کو یہاں درج کرنا مشکل ہے۔ چند ایک تفاصیل بطور نمونہ درج ذیل کی جاتی ہیں۔ یہ احادیث "مشکوٰۃ" شریف کے اُس اردو ترجمہ سے لی گئی ہیں جسے مولوی نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی نے شائع کیا ہے۔ یہ احادیث اُس کتاب کی دوسری جلد کے صفحات صفحہ ۳۲۰ لغایت صفحہ ۳۳۲ پر درج ہیں۔ ہر حدیث سے پہلے اس کا نمبر شمار بھی دیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے :-

(۵۳۴۴) ابی ہریرہ رض کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جنت میں ایک درخت ہے اگر کوئی سوار اس کے سایہ میں سو برس تک چلتا رہے تب بھی وہ سایہ ختم نہ کر سکے اور جنت میں تمہاری کمان کی برابر جگہ ان تمام چیزوں سے بہتر و برتر ہے جن پر آفتاب طلوع یا غروب ہوتا ہے (بخاری و مسلم)

(۵۳۴۵) ابی موسیٰ رض کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جنت میں مومن کے لئے ایک خالی موتی کا ایک خیمہ ہوگا جس کا عرض (ایک روایت میں ہے) جس کا طول ساٹھ کوس کا ہوگا اس خیمہ کے ہر گوشے میں اس کی بیویاں وغیرہ ہوں گی اور گوشے کے آدمی دوسرے گوشہ کے آدمیوں کو نہ دیکھ سکیں گے۔ ان سب گھروں میں مسلمان چلتا پھرتا رہے گا۔ اور مومن کے لئے دو جنتیں ہونگی۔ جن کے برتن اور تمام چیزیں چاندی کی ہوں گی۔ اور دو جنتیں سونے کی جن کے برتن اور تمام چیزیں سونے کی ہوں گی، اور لوگوں اور ان کے پروردگار کے درمیان بزرگی و عظمت باری کا صرف ایک پردہ حائل ہوگا (یعنی) جنت عدن کے اندر۔ (بخاری و مسلم)

(۵۳۴۷) انس رض کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے۔ جنت میں ایک بازار ہے جس میں جمعہ کو جنتی جمع ہوں گے۔ اور وہاں شمالی ہوا چلے گی، جو جنتیوں کے منہ اور کپڑوں پر خوشبو ڈالے گی۔ اور اس کے حسن و جمال میں زیادتی ہو جائے گی۔ پھر جب وہ زیادہ حسین جمیل بن کر اپنی بیویوں کے پاس جائیں گے تو ان کی بیویاں کہیں گی قسم ہے خدا تعالےٰ کی ہم سے جدا ہو کر تم نے اپنے حسن و جمال کو بڑھا لیا۔ اس کے جواب میں وہ کہیں گے۔ اور ہمارے بعد تمہارے حسن و جمال میں زیادتی ہوگی۔ (مسلم)

(۵۳۴۸) ابی ہریرہ رض کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جو لوگ جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے۔ وہ چودھویں رات کے چاند کی مانند ہوں گے اور ان کے بعد جو جماعت داخل ہوگی۔ وہ اس روشن ستارے کی مانند ہوگی جو سورج اور چاند سے کم اور دوسرے ستاروں سے زیادہ روشن ہے۔ اور جنتیوں کے دل ایک شخص کے دل کی مانند ہوں گے یعنی نہ تو ان میں اختلاف ہوگا۔ اور نہ بغض و عداوت۔ اور جنت میں ہر جنتی کی دو بیویاں حوریں میں سے ہوں گی۔ جن کی پنڈلیوں کا گودا ہڈی اور گوشت کے اندر نظر آتا ہوگا (یعنی وہ اس قدر حسین ہوں گی، کہ ان کا گودا ہڈیوں اور گوشت کے اندر سے دکھائی دے گا۔) جنتی صبح و شام اللہ تعالےٰ کو یاد کریں گے۔ نہ تو بیمار ہوں گے۔ نہ پیشاب کریں گے نہ پائخانہ پھریں گے، نہ تھوکیں گے، اور نہ ریٹھ سنکیں گے۔ اور جنتیوں کے برتن سونے چاندی کے ہوں گے۔ ان کی

گٹھلیاں سونے کی ہوں گی۔ ان کی انگیٹھیوں کا ایندھن اگر ہوگا۔ ان کا پسینہ مشک ہوگا، اور سارے جنتی ایک شخص کی سیرت وعادت پر ہوں گے۔ اور صورت میں اپنے باپ آدمؑ کی شکل پر اور ان کا قد ساٹھ گز اونچا ہوگا۔ (بخاری ومسلم)

(۵۳۵۴) جابرؓ کہتے ہیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے۔ جنتی جنت میں کھائیں گے اور پئیں گے۔ لیکن نہ تو تھوکیں گے، نہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ پھریں گے اور نہ ہی ناک سنکیں گے۔ صحابہ نے پوچھا کھانے کا فضلہ کیا ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا ڈکار ہو جائے گا۔ اور پسینہ مشک کی خوشبو کی مانند ہے۔ اور سبحان اللہ والحمد للہ کہنا جنتیوں کے دل میں ڈال دیا جائے گا۔ اور وہ اس طرح ان کی زبان پر رواں ہوگا جیسے سانس جاری ہے (مسلم)

(۵۳۵۸) ابی ہریرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے۔ جنت میں جو درخت بھی ہے، اس کا تنہ سونے کا ہے۔ (ترمذی)

(۵۳۶۱) ابی سعیدؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے خداوند تعالیٰ کے اس قول وفرش مرفوعہ کے متعلق فرمایا کہ ان بچھونوں کی بلندی اتنی ہوگی جتنی کہ آسمان وزمین کے درمیان مسافت ہے یعنی پانچ سو برس کا راستہ (ترمذی)

(۵۳۶۲) ابی سعیدؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے۔ قیامت کے دن جنت کے اندر جو لوگ سب سے پہلے داخل ہوں گے ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی مانند ہوں گے۔ اور دوسری جماعت جو ان کے بعد داخل ہوگی ان کے چہرے آسمان کے سب سے زیادہ چمکنے والے ستارے کی مانند ہوں گے۔ اور ہر جنتی کو دو بیویاں ملیں گی۔ ہر بیوی کے جسم پر ستر جوڑے لباس کے ہوں گے اور ان کی پنڈلیوں کے اندر کا گودا نظر آتا ہوگا۔ (ترمذی)

(۵۳۶۳) انسؓ کہتے ہیں نبی صلعم نے فرمایا ہے۔ جنت میں مومن کو جماع کی اتنی قوت عطا کی جائے گی (یعنی مثلاً دس عورتوں سے جماع کرنے کے وقت) پوچھا گیا۔ یا رسول اللہ صلعم! کیا مرد کو اتنی عورتوں سے جماع کرنے کی قوت ہوگی؟ فرمایا، جب مرد کو سو مردوں کے برابر قوت عطا کی جائے گی تو پھر وہ کیوں اتنی عورتوں سے جماع کی قوت نہ رکھ سکے گا۔ (ترمذی)

(۵۳۷۰) ابی ایوبؓ کہتے ہیں۔ کہ ایک دیہاتی نے حاضر ہو کر عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ! میں گھوڑوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔ کیا جنت میں گھوڑے ہوں گے؟ آپ نے فرمایا۔ اگر تجھ کو جنت میں داخل کیا گیا تو تجھ کو یاقوت کا ایک گھوڑا دیا جائے گا۔ جس کے دو بازو (پر) ہوں گے۔ پھر تجھ کو اس پر سوار کیا جائے گا اور جہاں تو جانا چاہے گا، یہ گھوڑا تجھ کو اڑا کر لے جائے گا۔ (ترمذی)

(۵۳۷۵) ابی سعیدؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے ادنیٰ درجہ کا جنتی وہ ہوگا جس کے پاس اسی ہزار خادم ہوں گے اور بہتر بیویاں اور اس کے لئے موتی، زبرجد اور یاقوت کا خیمہ ہوگا اتنا بڑا جتنی مسافت کہ جابیہ اور صنعا کے درمیان ہے۔ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے۔ جنتیوں میں سے جو لوگ دنیا کے اندر مریں،

(یعنی وہ لوگ جو جنت جائیں گے (خواہ وہ چھوٹی عمر کے ہوں یا بڑی عمر کے جنت کے اندر تیس سال کی عمر کے ہو جائیں گے۔ اس سے زیادہ ان کی عمر نہ ہوگی۔ اور اسی طرح دوزخی) ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضور صلعم نے فرمایا ہے۔ جنتیوں کے سر پر تاج رکھے ہوں گے۔ اور ان تاجوں کا معمولی موتی ایسا ہوگا جو مشرق و مغرب کے درمیان روشن کر دے۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ کہ رسول خداؐ نے فرمایا ہے کہ جب جنتی جنت کے اندر اولاد کا خواہشمند ہوگا۔ تو حمل اور بچہ کی (تیس سال کی) عمر ایک ساعت میں وقوع پذیر ہوگی (یعنی یہ سب باتیں ایک ساعت کے اندر عمل میں آجائیں گی۔ اور تیس سال کا بچہ پیدا ہو جائیگا) ابواسحٰق بن ابراہیم ؒ کہتے ہیں۔ کہ جنتی کے اس خواہش کا پورا ہونا ممکن تو ہے۔ لیکن وہ ایسی خواہش نہیں کرے گا۔

(ترمذی۔ یہ حدیث غریب ہے)

(۵۳۴۸) ابی سعیدؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جنت میں مرد ستر مسندوں پہ تکیہ لگا کر بیٹھے گا۔ اور یہ صرت ایک پہلو پر ہوں گے دوسرے پہلو پہ اور طرح طرح کی مسند اور تکیے ہوں گے) پھر جنت کی حوروں میں سے ایک عورت اس کے پاس آئے گی اور اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس کے کاندھے پر ٹھوکا دیگی۔ مرد اس کی طرف متوجہ ہوگا اور اس کے رخساروں میں جو آئینہ سے زیادہ صاف اور روشن ہوں گے اپنا چہرہ دیکھے گا۔ (وہ اس عورت کا معمولی سا موتی اتنا بیش قیمت ہوگا کہ) مشرق و مغرب کے درمیان کو روشن کر دے گا۔ یہ عورت اس مرد کو سلام کرے گی اور مرد اس کے سلام کا جواب دے گا اور پوچھے گا کہ تو کون ہے؟ وہ عورت کہے گی، میں مزید[عہ] میں سے ہوں (یعنی ان چیزوں میں سے جو خداوند تعالیٰ جنتیوں کو اپنے پاس سے اور دے گا) اس عورت کے جسم پر ستر کپڑے (رنگ برنگ کے) ہوں گے جن کے اندر سے اس کا جسم نظر آئے گا۔ یہاں تک کہ اس کی پنڈلی کا گودا تک بھی دکھائی دے گا اور اس کے سر پہ تاج ہوں گے جن کا ایک معمولی موتی مشرق و مغرب کے درمیان کو روشن کر دے گا۔ (احمد)

ایک اور

آخر میں ایک روایت تفسیر ابن کثیر کے حوالے سے بھی ملاحظہ فرمایئے۔ لکھا ہے:۔

حضرت ابوطیبہؒ فرماتے ہیں کہ جنتیوں کے سروں پر ابر آئے گا
اور انہیں ندا ہوگی کہ بتلاؤ کس چیز کا برسنا چاہتے ہو۔ پس
جو لوگ جس چیز کا برسنا چاہیں گے، وہی چیز ان پر اس بادل

عہ قرآن مجید میں ہے لَهُم مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ جنت میں جنتیوں کو ہر وہ چیز ملے گی جس کے وہ خواہشمند ہوں گے اور اس کے علاوہ ہماری طرف سے اور زیادہ دیا جائے گا۔ کہ اسی کی طرف ان الفاظ کا اشارہ ہے۔ ۱۲۔ مترجم ؎

سے برسے گی۔ یہاں تک کہ کہیں گے کہ ہم پر ابھرے ہوئے
سینے والی ہم عمر عورتیں برسائی جائیں۔ چنانچہ وہی برسیں گی۔
اسی لئے فرمایا کہ فضل کبیر، زبردست کامیابی، کامل نعمت
یہی ہے۔

(اردو ترجمہ تفسیر ابن کثیر از مولانا محمد جونا گڑھی — پارہ پچیسواں — ص۱۱)

یہ ہیں وہ احادیث جنہیں منسوب کیا جاتا ہے حضور نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کی طرف! یا للعجب۔

انگلستان کے احباب کی سہولت کیلئے

بزم طلوع اسلام بریڈفورڈ (انگلستان) نے ادارہ طلوع اسلام کی وساطت سے اپنے ہاں ماہنامہ طلوع اسلام اور ادارہ طلوع اسلام کے دیگر لٹریچر کا انتظام کیا ہے۔ بزم مذکور پرویز صاحب کا درس قرآن بذریعہ ٹیپ سنانے کا بھی اہتمام کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں (طلوع اسلام کی خریداری سے متعلق بالخصوص) انگلستان کے احباب براہ راست بزم طلوع اسلام کے نمائندہ سے حسب ذیل ایڈریس پر رابطہ قائم کریں۔

رشید احمد بٹ ۱۰۶۔ سالٹ سٹریٹ — مینگھم
بریڈفورڈ ۸ یارک شائر
(انگلستان)

کراچی میں ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات

کراچی میں ادارہ طلوع اسلام کی شائع کردہ کتب محترم پرویز صاحب کی مطبوعات اور تحریک کا لٹریچر حسب ذیل پتہ سے مل سکے گا۔

محمد اسلام صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام ۱۰۰/۳ نوکس روڈ نیو ٹاؤن۔ کراچی۔ فون نمبر ۲۳۵۸۸۰

(علاوہ بریں ہر اتوار کی صبح کو سندھ مدرسہ اسمبلی ہال (بندر روڈ) کراچی میں پرویز صاحب کے درس قرآن کے موقع پر بھی تحریک کا لٹریچر اور ضروری مطبوعات حسب ذیل مہیا کی جاتی ہیں۔

ادارہ کی تازہ پیش کش

جہانِ فردا

صاحب
پرویز
کے
انقلاب آفریں مضامین اور تقاریر کا
تیسرا مجموعہ

عنوانات ملاحظہ فرمائیے

(۱) یورپ کا واویلا۔
(۲) مثالی مملکت۔
(۳) قائدِ اعظم اور اسلامک آئیڈیالوجی۔
(۴) قائدِ اعظم کا پاکستان۔
(۵) پاکستان کس نے بنایا۔
(۶) جنگ اور انسان۔
(۷) بنیادی حقوقِ انسانیت۔
(۸) ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟
(۹) وحدتِ ملت۔
(۱۰) اولیاء اللہ کون ہیں؟
(۱۱) قیامت موجود۔
(۱۲) حضرت مسیح کی انقلاب آفریں تعلیم
(۱۳) حضور رسالتمآب کی کہانی۔ خدائے برتر کی زبانی
(۱۴) اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں۔
(۱۵) اسلامی آئین کے بنیادی اصول۔

کتاب ۲۲×۱۷ کے سائز پر (یعنی اُسی سائز پر جس پر "فردوسِ گم گشتہ" اور "سلسبیل" شائع ہوئی تھی)۔ ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ہے عام اشاعت کی غرض سے اسے چیپ ایڈیشن کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔

قیمت فی جلد ———— پانچ روپیہ

(۲) پیشگی خریداروں میں سے جو صاحب یہ کتاب نہ لینا چاہیں وہ ۱۰ اگست تک اس امر کی اطلاع دیدیں، ورنہ کتاب تمام پیشگی خریداروں کو بھیجدی جائے گی۔

(۳) فرمائشیں جلد بھیجئے تاکہ کتاب ملنے میں تاخیر نہ ہو۔

ملنے کا پتہ

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی - گلبرگ (۲) - لاہور

سرسیدؒ کی مخالفت

پاکستان کے معمارِ اول سرسید احمد خانؒ نے قوم کے لئے کیا کچھ کیا، اس کے متعلق طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں مختصر الفاظ میں لکھا جا چکا ہے۔ اس نے "اسبابِ بغاوتِ ہند" اور ہنٹر کی رسوائے عالم کتاب (انڈین مسلمز) کا جواب لکھ کر ہوت کے اس سیلاب کو روک دیا جس نے اس زمانے میں مسلمانانِ ہند کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اس نے سر ولیم میور کی سیرتِ نبی اکرمؐ سے متعلق تعصب انگیز کتاب کا جواب لکھ کر حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کو دامنِ سحر کی طرح پاک اور صاف دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس نے قرآن کریم کی ایک جدید تفسیر لکھ کر اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ قرآنی حقائق پر ہر دور میں انسانی علم کی سطح کے مطابق غور و تدبر کیا جا سکتا ہے۔ اس نے نیچر، نیچر پکار کر مسلمانوں کی توجہ اس اہم حقیقت کی طرف منعطف کرائی کہ جب تک وہ علوم فطرت کی تحصیل نہیں کریں گے۔ دنیا کی زندہ قوموں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔ اور اس نے اپنی ان تھک کوششوں سے قوم کے سامنے تعلیم جدید کے وہ دروازے کھولے جو انہیں رفتہ رفتہ منزلِ پاکستان تک لے آئے۔ آج سرسید کے بعض خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اس کے نتائجِ فکر کی بعض شقوں کو سقیم ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس کے طریقِ کار کے بعض اجزاء پر تنقید کی جا سکتی ہے ـــــ اس لئے کہ یہ بالآخر انسانی کوششیں تھیں جو سہو و خطا سے پاک نہیں ہو سکتیں ـــ لیکن قوم کے احیاء نو کے لئے اس نے جو کچھ کیا اس کے متعلق دو آراء نہیں ہو سکتیں ـــ لیکن جب سرسیدؒ قوم کے لئے یہ کچھ کر رہا تھا ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ کس کس انداز سے اس کی مخالفت کر رہا تھا، یہ باب کچھ کم حیرت ناک اور تاسف انگیز نہیں۔ آج کی صحبت میں ہم اس مخالفت کی تھوڑی سی تفصیل۔ مولانا حالیؒ مرحوم کی تالیف "حیاتِ جاوید" سے پیش کرتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ہماری تاریخ کے جس دور میں بھی کسی دردمند انسان نے قوم کی بھلائی کے لئے کچھ سوچا یا کچھ کہا۔ اس طبقہ نے کس کس انداز سے اس کی مخالفت کی۔ یہی کچھ پہلے ہوا اور یہی آج ہو رہا ہے۔ حالیؒ مرحوم لکھتے ہیں:

مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے جو باوجود ذی وجاہت اور ذی رعب ہونے کے

علوم دینیہ سے بھی آشنا تھے۔ ایک مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر کانپور، اور دوسرے مولوی علی بخش خانصاحب سب جج گورکھپور، اگرچہ دونوں صاحب مذہبی عقائد و خیال کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ضد حقیقی تھے یعنے پہلے سخت وہابی اور دوسرے سخت بدعتی اور یہ ایسا اختلاف تھا کہ کسی بات پر دونوں کا اتفاق کرنا محال عادی معلوم ہوتا تھا، باوجود اس کے مدرسۃ العلوم کی مخالفت پر دونوں ہمزبان اور متفق الکلمہ تھے۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں ان کا منبع انھیں دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں اگر ان کی مخالفتوں کا باعث مذہبی جوش اور حمیتِ اسلامی ہوتی تو اُن کا کام نہایت تعریف کے لائق ہوتا مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں کی تمام مخالفتوں کی طرح ان کی مخالفت بھی محض ذاتیات پر مبنی تھی جس کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ ایک اور وجہ ان کی مخالفت کی یہ تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرسۃ العلوم کے سخت مخالف تھے اور ان میں سے بعض کے ساتھ ان دونوں صاحبوں کو خاص تعلق تھا اس لئے سرسید کی مخالفت کو انھوں نے ایک ذریعہ ان کی خوشنودی اور اپنی سرخروئی کا سمجھا تھا۔

پھر بہت سے دیسی اخباروں نے جب دیکھا کہ سرسید سے بہت سے مسلمان عموماً بدگمان اور متنفر ہوتے جاتے ہیں تو انھوں نے اپنے اخباروں کی گرم بازاری اسی میں دیکھی کہ جہاں تک ممکن ہو کوئی پرچہ ایسا نہ نکلے جس میں سرسید اور ان کے احوان و انصار پر اعتراضوں کی بوچھاڑ نہ ہو۔ بعض مولوی جو زمانہ کے انقلاب سے نہایت کس مپرسی حالت میں تھے۔ انھوں نے سرسید کی عام مخالفت سے اس طرح فائدہ اٹھانا چاہا کہ انکی تصنیفات کا رد لکھنے پر کمر باندھی اور فی الواقع اس سے ان کو بہت بڑی کامیابی ہوئی۔ ان کی کتابیں تمام ہندوستان میں شائع ہوگئیں اور کئی کئی بار اُن کے چھپنے کی نوبت آئی۔

الغرض سرسید کے خیالات اور ان کی تحریرات کے برخلاف مستقل کتابیں اور رسالے لکھے جانے لگے رسالہ طعام اہل کتاب کی رد میں مولوی امداد العلی نے امداد الاحتساب لکھی۔ مولوی محمد علی نے مزیل الاوہام نام ایک رسالہ شائع کیا۔ تہذیب الاخلاق کے توڑ پر خاص خاص اخبار اور رسالے جاری ہوئے۔ کانپور سے نور الآفاق اور نور الانوار اور مراد آباد سے لوح محفوظ نکلا۔ آگرہ سے تیرہویں صدی شائع ہوا۔ امداد الآفاق، شہاب ثاقب اور تائید الاسلام وغیرہ اضلاع شمال مغرب سے اور اشاعۃ السنہ پنجاب سے شائع ہوئے۔ سرسید کو ملحد لا مذہب، کرسٹان، نیچری، دہریہ، کافر، دجال اور کیا کیا خطاب دیئے گئے اُن کے کفر کے فتووں پر شہر شہر اور قصبہ قصبہ کے مولویوں سے مہریں اور دستخط کرائے گئے۔ یہاں تک کہ جو لوگ سرسید کی تکفیر پر سکوت اختیار کرتے تھے ان کی بھی تکفیر ہونے لگی۔ سرسید کے نام گالی اور دشنام سے بھرے ہوئے گمنام خط چاروں طرف سے آنے لگے اور ان گمنام خطوں کا سلسلہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے کم و بیش اخیر تک جاری رہا۔

سرسید نے ان نالائق خطوں میں سے ایک آدھ خط راقم کو بھی دکھایا ہے اور ایک خط جب کہ منشی سراج الدین احمد سرسید کی لائف لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے سرسید کے پاس آیا تھا اور ان کے پاس سرسید نے اس غرض سے بھیجا تھا کہ اس کو نہایت جلی حروف میں میری لائف میں درج کر دیا۔ چنانچہ وہ خط منشی صاحب کے مسودات میں ہم کو دستیاب ہوا ہے۔ جس میں اول سے آخر تک نہایت مغلظ گالیاں جو رذیل سے رذیل انسان کی زبان پر بھی نہیں آسکتیں۔ اگرچہ سرسید کی یہ خواہش تھی کہ وہ خط بجنسہ ان کی لائف میں درج کیا جائے۔ مگر ہماری غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ اس ملعون تحریر کو سرسید کی لائف میں نقل کر کے قوم کی نالائقی تمام دنیا پر ظاہر کریں۔

چونکہ سرسید کے مخالفوں کی عام تحریریں اور رسالے اور کتابیں اور میگزین اور اخبار زیادہ تر کذب و افترا اور تہمت و بہتان اور معاندانہ کج بحثیوں سے بھرے ہوتے تھے۔ اس لئے سرسید جہاں تک ہو سکتا تھا کسی کا جواب نہیں دیتے تھے۔ اور اپنے دوستوں کو بھی جواب دینے سے منع کرتے تھے۔ مگر اول اول جبکہ مخالفوں نے سرسید اور ان کے بعض دوستوں کی نسبت غلط افواہیں اڑانی شروع کیں اور لوگوں کو مجبور کیا کہ یا تو ان باتوں کا جواب دیجئے ورنہ سمجھا جائے گا کہ آپ کی نسبت مخالفوں کے الزامات سب صحیح ہیں اور نیز ان تحریروں سے چندے کے رک جانے کا بھی اندیشہ تھا اس لئے کبھی کبھی سرسید اور مولوی مہدی علی نے تہذیب الاخلاق میں ان کے جواب لکھنے پر قلم اٹھایا۔ از انجملہ سرسید کا مضمون "دافع البہتان" اور سید مہدی علی کا مضمون "تکفیر مسلمان" اور "سوال و جواب" خصوصیت کے ساتھ دیکھنے کے لائق ہے۔

ایک اور مضمون سرسید نے ان ہی مخالفتوں کے ہجوم کے زمانہ میں لکھا تھا جس کا عنوان "حال خود یاران خود" ہے۔ یہ مضمون بھی نہایت لطیف اور دلچسپ ہے جس کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں

"ہم کو ملحد اور زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے۔ کیونکہ ہماری قوم نے خدائے واحد ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم و رواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخرالزماں محمد رسول اللہ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کئے۔ کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے۔ اور ہم اس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں جیسے ہمارے جد امجد ابراہیمؑ اپنے باپ آذر کے بتوں کو توڑنے والے تھے۔ ہم سچے خدائے واحد ذوالجلال کی جلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر لوگ ہم کو ملحد و زندیق و لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں؟ کیونکہ ہم ان کے خداؤں اور پیغمبروں کو نہیں مانتے۔

مگر طرفہ یہ ہے کہ ہم کو کرسٹان بھی کہتے ہیں۔ اور ہماری قوم کے ایک اخبار نویس نے چھاپا کہ ہم عیسائی ہو گئے

اور ایک گرجا میں جا کر بپتسمہ یعنی اصطباغ لیا۔ ہم کو اپنی قوم کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ اب ہماری قوم کا یہ حال ہو گیا ہے کہ علانیہ جھوٹ بولنے اور جھوٹ چھاپنے میں کچھ شرم و غیرت و حیا نہیں آتی۔ قومی ہمدردی جو خدا کی ایک بڑی نعمت ہے۔ خدا نے ہماری قوم کے دل میں کیسی مٹا دی ہے۔ اس شخص کو یہ بھی غیرت نہ آئی کہ میں ایک مسلمان شخص کی نسبت کس دل اور غیرت سے ایسی جھوٹ بات چھاپ دوں۔ ان باتوں سے ہم کو بلحاظ اپنی ذات کے کچھ بھی رنج نہیں ہوتا، مگر جو رنج و غم اور افسوس ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ افسوس ہماری قوم پر خدا کی کیسی خفگی ہے جو ایسی حالتوں میں گرفتار ہیں۔ ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین ''۔

مولوی امداد العلی نے جو تین استفتے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں بھیج کر سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کئے تھے ان میں سے ایک استفتے اس مضمون کا تھا کہ جس شخص کے ایسے اور ایسے عقائد اور اقوال و افعال ہوں وہ مسلمان ہے یا نہیں؟ اور دوسرا اس مضمون کا تھا کہ جو مدرسہ ایسا شخص فلاں فلاں اغراض سے قائم کرنا چاہے اسے چندہ دینا اور اس کی اعانت کرنی مسلمانوں کو جائز ہے یا نہیں؟ اور تیسرا اسی تاریخ ہندوستان کے ترجمہ کرانے کی بابت تھا جس میں مصنف نے آنحضرت کی نسبت اپنے عقیدہ کے موافق سخت اور ناملائم الفاظ لکھے تھے۔ یہ تمام فتوے اور استفتے مولوی امداد العلی نے اپنے ایک رسالہ کے آخر میں جس کا نام امداد الآفاق برجم اہل النفاق بجواب پرچہ تہذیب الاخلاق ہے چھاپ کر اس رسالہ کو تمام ہندوستان میں مفت تقسیم کیا تھا۔ اس کی ایک جلد ہماری نظر سے بھی گزری ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں، کیا سنی، کیا شیعہ، کیا مقلد کیا غیر مقلد، کیا وہابی، کیا بدعتی، سب فرقوں کے مشہور اور غیر مشہور عالموں اور مولویوں کی ان فتووں پر مہریں یا دستخط ہیں اور خاص کر سنی مولویوں میں سے اکثر نے بہت شرح اور بسط کے ساتھ جواب لکھے ہیں۔ از انجملہ دلی اور لکھنؤ کے سب سے بڑے عالموں کے جواب میں سے کچھ کچھ فقرے بطور نمونے کے اس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں:۔

مولوی کریم اللہ صاحب مرحوم دہلوی لکھتے ہیں "در سوخ ایں سانحہ ایمان زادے و وقوع ایں واقعہ ہوش ربا و ظہور ایں معاملہ ہیبت افزا و حدوث ایں حادثہ الحاد انشا کہ تعمیر کرنا اور کرانا بقول فعل اس قائل کے ایسے مکان کا اور معاونت کرنی ایسے طلباء کی اور اپنے مال معصوم کو غیر معصوم کرنا اور ہم پایہ ہونا اس عقیدہ کے کہ جس کا حال بد مآل اس سوال میں مذکور ہے بالکل باطل اور ایسے ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محل تعلیم و تحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے۔ اور زمرہ حیوانات میں داخل ہونا ہے۔ اعوذ باللہ

من الحور بعد الکور۔ بالکل عاطل بلکہ صرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب کندہ ہونا جہنم، اور ایسے محل میں ساعی ہونا ہیمہ اور حطب بننا لازم..... الحاصل معاونت ایسے غارتی ایمان اور مال کی او ہللہ سمجھنا اپنے مال کا خیالِ خام ہے۔ نے نے یوں سمجھے کہ میں اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرتا ہوں اور اپنے اعمال صالحہ کو مٹاتا ہوں، پس مرد دین دار بلکہ تمامی سُنّی و شیعی و خارجی و سائر ہنود و تمامی سکنائے اہل زمین پر واجب اور محتم ہے کہ ایسے کلام واہی اور ایسے عقیدہ واہی پر عقیدہ اپنا نہ جاویں بلکہ ہر فرد ہر مذہب کا اس شخص کو ہادم بنانے اپنے مذہب کا بوجھے اور اس امر لوچ پر دل نہادہ ہووے اور اپنے دل میں اس امر کا انجام سوچے کہ کیا جال بچھایا ہے۔"

مولوی عبدالحئی صاحب مرحوم جو علمائے فرنگی محل میں نہایت نام آور وہ تھے منقفے عبارت میں تحریر فرماتے ہیں" وجود شیطان اور اجنّہ کا منصوص قطعی ہیں اور منکر اس کا شیطان ہے بلکہ اس سے بھی زائد کیونکہ خود شیطان کو بھی اپنے وجود سے انکار نہیں..... اور وجود آسمان منصوصِ قرآنی ہے منکر اس کا مبتلائے وسواس شیطانی ہے۔ حُرمتِ متخنقہ طیور منصوص کلام ربّ غفور ہے اور سلف سے تا خلف اتفاق اس پر ماثور ہے۔ انکار اس کا موجب گمراہی و فجور ہے...... مذہب نیچر خدا جانے کیا بلا ہے، ہر متشرع اور متدین کو اس کے قبول سے ابا ہے...... ہر مسلمان کو حق جل شانہٗ اتباعِ شریعتِ محمدیہ پر قائم رکھے اور مذہب نیچر اور مشرب بدعت سے محفوظ رکھے۔ جو شخص کہ اعتقادات اس کے فاسدہ ہیں جو کہ سوال میں مسطور ہوتے ہیں وہ شخص مخرب دین، ابلیس لعین کے وسوسے سے صورتِ اسلام میں تخریب دینِ محمدی کی فکر میں ہے اور بنام تجدید مدرسہ جدیدہ فسادِ شریعت اس کی منظورِ نظر ہے۔ جو چیزیں کہ اس کے نزدیک موجب تہذیب ہیں اہل سنت کے نزدیک باعثِ تخریب ہیں۔ فالحذر الحذر یا ایہا المسلمون فالاحذر یا ایہا المومنون۔"

اگرچہ مولوی امداد العلی کی کوشش سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کرنے میں حدِ غایت کو پہنچ گئی تھی۔ دلی، رام پور، امروہہ، مراد آباد، بریلی، لکھنؤ، بھوپال اور دیگر مقامات کے سا تھ عالموں اور مولویوں اور واعظوں نے کفر کے فتووں پر مہریں اور دستخط کئے تھے، گویا ہندوستان کے اہل حل وعقد کا اس حکم پر اجماع ہو گیا تھا۔ صرف خدا کی طرف سے اس کی تصدیق اور تصویب باقی رہ گئی تھی سو مولوی علی بخش خان نے یہ کمی پوری کر دی۔ انہوں نے غالباً اسی غرض سے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور مکہ معظمہ میں جا کر مذاہب اربعہ کے سامنے دو استفتے عربی زبان میں پیش کئے جن میں سے ایک کا ترجمہ یہ ہے۔

آپ کیا فرماتے ہیں اس شخص کے باب میں جو ابلیس کے وجودِ خارجی سے انکار کرتا ہے اور کہتا

ہے کہ اس سے مراد قوتِ بہیمیہ ہے جو نفسِ انسان میں ہے اور ملائکہ کا سجدہ آدم کے واسطے حقیقی سجدہ نہ تھا بلکہ اس سے قوٰی کا مطیع ہونا مراد ہے اور ابی و استکبر سے عدمِ اطاعت قوتِ بہیمیہ مراد ہے جو آدمی کی اغوا کرنے والی ہے نہ کہ حقیقی سجدہ سے انکار کرنا اور کہتا ہے کہ افلاک اجسام نہیں ہیں بلکہ اُن سے فضائے بسیط یا سیارات مراد ہیں، اور کہتا ہے کہ لونڈی غلام بنانا حرام ہو گیا ہے۔ آیۂ اِمّا منًّا بعد و اِمّا فداءً اور یہ آیت نازل ہوئی ہے فتح مکہ میں اور یہ سب سے اخیر آیت ہے جو قیدیوں کے باب میں نازل ہوئی ہے، اور کہتا ہے کہ معراج خواب میں ہوئی تھی اور جسم کے ساتھ آنحضرتؐ کے جانے سے انکار کرتا ہے اور انکار کرتا ہے شقِ صدرِ آنحضرتؐ کا اور کہتا ہے کہ گلا گھونٹے ہوئے پرند حلال ہیں۔ پس ایسے شخص کے باب میں کیا حکم ہے؟

اس استفتے کے جواب میں مذاہبِ اربعہ کے چاروں مفتیوں[1] نے جو مکہ معظمہ میں رہتے ہیں علیحدہ علیحدہ عبارت لکھی ہے اور ان چاروں صاحبوں کے جوابات کا ماحصل یہ ہے کہ "یہ شخص ضال اور مضل ہے بلکہ وہ ابلیس لعین کا خلیفہ ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنے سے بھی بڑھ کر ہے کہ خدا اس کو سمجھے۔ واجب ہے اولو الامر پر اس شخص سے انتقام لینا۔ اس کو تنبیہ کرنی چاہیئے اور اگر جاہل ہو تو اسے سمجھانا چاہیئے۔ پھر اگر باز آوے تو بہتر ہے ورنہ ضرب اور حبس سے اس کی تادیب کرنی چاہیئے۔ اگر وُلاۃ اسلام میں کوئی صاحب غیرت ہو۔ نہیں تو خدا اس کو سمجھے اور اس کی ضلالتوں اور رسوائیوں کی سزا دے گا۔" اس کے بعد سید محمد کتبی حنفی مدرس حرم شریف اور مولانا رحمت اللہ مرحوم ہندی مہاجر مکہ معظمہ نے چاروں مفتیوں کے جوابوں کی تصویب کی ہے۔

پھر مولانا علی بخش خان مدینہ منورہ گئے ہیں اور اسی قسم کا استفتا شیخ محمد امین بالی مفتی احناف کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ ان کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ دُرِ مختار اور اس کے حواشی سے معلوم ہوتا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی کسی جانب مائل ہو گیا ہے۔ یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا یا اباحتی ہے کیونکہ منخنقہ کا کھانا مباح بتلاتا ہے۔ اور اہلِ مذہب (حنفی) کے بیانات سے مفہوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی توبہ گرفتاری کے بعد قبول نہیں ہوتی پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے

---

[1] یعنی شیخ عبدالرحمٰن بن شیخ عبداللہ سراج مفتی حنفیہ اور احمد بن زین دحلان مفتی شافعیہ اور محمد بن عبداللہ بن حمید حنابلہ اور حسین بن ابراہیم مفتی مالکیہ ۱۲

ورنہ اس کا قتل واجب ہے۔ دین کی حفاظت کے لئے اور اولو الامر پر واجب ہے کہ ایسا کریں۔"

دوسرے استفتا کا ملخص یہ ہے کہ اس مدرسہ کے جواب میں آپ کیا فرماتے ہیں جس کے بانی کے ایسے اور ایسے عقائد اور اعمال ہوں اور جو یہ کہتا ہو کہ اہل اسلام کے اخلاق مہذب نہ ہوں گے جب تک کہ وہ ستِ ضروریہ میں یورپ کے فلاسفہ جدیدہ کی پیروی نہ کریں گے اور یہ کہ تمام علوم دینیہ قدیمہ جو مسلمانوں نے مدون کئے ہیں بے فائدہ ہیں اس لئے ضرور ہے کہ ایک مدرسہ قائم کیا جائے جس میں علوم جدیدہ کی تعلیم ہو اور اہل یورپ کے طریقہ پر ستِ ضروریہ سکھائے جائیں اور کتب دینیہ میں سے ایسے مضامین انتخاب کئے جائیں جو فلسفہ جدیدہ کے خلاف نہ ہوں اور جب لوگوں نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ مدرسہ تو الحاد و زندقہ کا مدرسہ ہوگا اور اس کی اعانت سے انکار کیا تو اس نے جواب دیا کہ میں اپنے معتقدات سے تو رجوع نہ کروں گا اور اپنے ارادہ سے بھی باز نہ آونگا۔ مگر مدرسے کا جو انتظام ہوگا وہ مجلس شوریٰ کی رائے کے موافق ہوگا۔ حالانکہ اس مجلس کے اکثر رکن اُسی کے گروہ کے ہیں اور ان کی رائیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں اور پچھلی پہلی کو منسوخ کرتی رہتی ہیں۔ پس ایسی حالت میں آیا مسلمانوں کو اس کی اعانت کرنی جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا"

اس کا جواب بھی حرمین شریفین کے مفتیوں نے الگ الگ لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "مدرسہ جس کو خدا برباد اور اس کے بانی کو ہلاک کرے ——— اس کی اعانت جائز نہیں ہے اور اگر مدرسہ بن کر تیار ہو جائے تو اس کو منہدم کرنا اور اس کے بانی سے اس کے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے اور ہر شخص پر جس میں حمیت اسلامی ہو واجب ہے اس مدرسہ کی مخالفت جہاں تک کہ قدرت ہو اور ادنےٰ درجہ یہ ہے کہ دل سے اس کا مخالف ہو۔"

حُسن اتفاق سے جس زمانے میں یہ فتوےٰ مولوی علی بخش خان حرمین شریفین میں وہاں کے علماء اور مفتیوں سے لکھوا رہے تھے حافظ محمد حسین نام ہندوستان کے ایک بزرگ وہاں موجود تھے جو حج و زیارت کے ارادہ سے وہاں گئے تھے۔ ادھر تو مولوی علی بخش خان نے عرب سے آکر مذکورہ بالا فتووں کی ہندوستان میں منادی اور ادھر اس نیک دل مسلمان نے باوجودیکہ سرسید سے مطلق شناسائی نہ تھی ایک طویل مضمون سرسید کی تکفیر کی تردید میں انہیں دنوں میں اخبار کوہ نور لاہور میں چھپوایا جو تہذیب الاخلاق میں نقل کیا گیا تھا جس کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

وہ علمائے حرمین شریفین کے فتووں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "فتوے لکھنے لکھانے کا حال یہاں یہ ہے (یعنی ہندوستان میں) وہی وہاں (یعنی حرمین شریفین میں) ہے جس مضمون سے چاہا فتوے لکھ لیا، جس سے دستخط کراتے ہوئے جو چاہا سمجھا کر دستخط کرا لئے، جیسے عالم یہاں ہیں ویسے وہاں ہیں، صرف اتنا

فرق ہے کہ ان کی زبان ہندی ہے اُن کی عربی ..... وہاں جو ہندوستانی اہل سنت والجماعت کے عالم ہیں وہ دو گروہ ہیں۔ ایک بدعتی، دوسرے وہابی، جو بدعتی ہیں وہ وہابیوں کو کافر کہتے ہیں جو وہابی ہیں وہ بدعتیوں کو بُرا کہتے ہیں۔ جب بدعتیوں کا وار چل جاتا ہے وہابیوں کو نکلوا دیتے ہیں۔ جب وہابی غالب ہو جاتے ہیں بدعتی چپ ہو جاتے ہیں۔ ان دنوں بدعتیوں کا وار چل رہا ہے ..... سید احمد خان صاحب حرمین شریفین میں بھی مشہور ہیں، اکثر ہندوستانی اور بعض عرب اُن کے نام اور ان کے خلاف واقع حال سے واقف ہیں۔ وہاں مشہور ہے کہ سید احمد خان لندن گئے تھے وہ انگریزوں سے اقرار کر کے آئے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو جہاں تک ہو سکے گا کرسٹان کریں گے اور دین اسلام سے پھیریں گے۔ اب وہ اپنے اقرار کے موافق مسلمانوں کو بہکا کر دین اسلام سے پھیرتے اور نئے نئے عقائد سکھلاتے ہیں۔ یہ جو فتوے میں لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے بھی ان کا فتنہ بڑھ کر ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ظاہر میں مسلمان رہ کر اور دین و اسلام کے نام سے وعظ و نصیحت کر کے عیسائی کرتے ہیں۔ جس کسی نے سید احمد خان صاحب کا یہ حال سنا ..... وہ ان سے نفرت کرنے لگا اور برا جاننے لگا ..... جب اس سے واقعی حال کہا گیا کہ سید احمد خان ایسے آدمی نہیں ہیں، یہ مسلمان ہیں۔ ظاہر اور باطن میں یکساں ہیں، مسلمانوں کو مسلمان رکھنا چاہتے ہیں۔ قرآن کے جو معنی ہیں وہی کہتے ہیں، حدیث کو معتبر جانتے ہیں، جو حدیث نہیں ہے اس کو بے اعتبار سمجھتے ہیں۔ اہل کتاب کے ذبیحہ کو قرآن مجید کے موافق حلال کہتے ہیں۔ سور اور شراب کو حرام سمجھتے ہیں، انسانوں سے انسانیت کی وجہ سے قرآن مجید کے مطابق دوستی رکھنی اور ہر ایک کی بھلائی چاہنی موجب ثواب بتاتے ہیں، شیطان اور آسمان کے منکر نہیں مقر ہیں، صورت اور طرح میں جو بعض عالموں نے بیان کی ہے ان کے ہمزبان ہیں اکثروں کے ساتھی نہیں، امام کو امام جانتے ہیں پیغمبر نہیں مانتے، مفسر کو مفسر مانتے ہیں الہامی نہیں جانتے، مجتہد کو مجتہد جانتے ہیں۔ خاتم المجتہدین نہیں سمجھتے۔ ہر وقت اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں کی دین و دنیا درست ہو۔ ہزاروں روپے اپنے خرچ کرتے ہیں۔ دل و جان سے اس کے خواستگار ہیں۔ اپنا جان و مال مسلمانوں کے واسطے وقف کر رکھا ہے۔ چاہتے ہیں کہ مسلمان دنیا میں سردار ہو جائیں اور دین میں ایمان دار۔ یہ سن کر وہ سید احمد خان کی تعریف کرنے لگا۔ ہندوستانی نے کہا بہت اچھے آدمی ہیں اور عرب نے کہا طیب ..... جناب مولانا علی بخش خاں صاحب بہادر جب تک مکہ معظمہ میں رہے ان کو شغل رہا۔ جب مدینہ منورہ میں گئے وہاں بھی انہیں فتووں کی فکر رہتی، حالانکہ مدت قیام مدینہ منورہ کی تھوڑی تھی یعنی آٹھ سات روز کہ ضروری کام اور زیارات طیبات بھی مشکل سے انجام ہوتے ہیں۔ مولانا صاحب اسی انتظام رہے۔ سوالات کا مسودہ مسجد نبوی میں روضہ مطہرہ کے روبرو ہوا مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اکثر ہندوستانی اور عرب سے مولانا صاحب یہی ذکر فرماتے رہتے اور اسی کی بحث ہوتی

رہتی۔ مولانا صاحب شہاب ثاقب اور ایک اور رسالہ کی کئی جلدیں لے گئے تھے، وہ بھی وہاں تقسیم فرمائیں۔
سید احمد خان صاحب کا کفر اور اسلام اور ان کے کفر کے فتووں کا مدار اُن کا حال بیان کرنے والوں پر منحصر ہے، نہ کہ مکہ والے ان کو جانیں نہ مدینے والے ان سے واقف۔ اگر کوئی چاہے تو سو فتوے ان کے اسلام کے حرمین شریفین سے واقعی حال بیان کر کے لا سکتا ہے۔۔۔۔۔ سید احمد خان صاحب کا اسلام مسلمانوں کے دلوں پر نسلاً بعد نسلٍ کندہ ہوتا چلا جائے گا۔ اور تھوڑے عرصے کے بعد سید احمد خان صاحب کے نام کے ساتھ مجتہد و مجدد کا لفظ لکھنا شروع ہو جائے گا۔ ان کے اسلام کے ثبوت میں کاغذ اور سیاہی کی مدد ضرور نہیں۔ جو بات کفر کی ہے وہ کفر کی ہے اور جو اسلام کی ہے وہ اسلام کی۔ سید احمد خان صاحب صرف اس سبب سے کہ حرمین شریفین کے عالموں نے اُن کے کفر کے فتوے دیئے۔ کافر نہیں ہو سکتے۔ جیسے یہاں کے عالم ہیں ویسے ہی وہاں کے۔ صرف زبان کا فرق ہے۔ اُنھیں کتابوں سے وہاں والے فتوے لکھتے ہیں انہیں سے یہاں والے۔"

اسی مضمون میں وہ ایک جگہ ہندوستانی مولویوں کا، جو مکہ معظمہ میں رہتے ہیں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں
"دو تین مولانا صاحبوں کے سامنے میں نے سید احمد خاں صاحب کی تعریف کی اور واقعی حال ان کا بیان کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ فلاں مولانا صاحب یا حکیم صاحب یا منشی صاحب ابھی ہندوستان سے آئے ہیں وہ اس کے خلاف کہتے ہیں، تم ہرگز سید احمد خان کا کہنا نہ مانو، ورنہ کافر ہو جاؤ گے میں نے کہا بہت اچھا سید احمد خاں صاحب کا کہنا نہ مانوں گا۔ ان کو برا جانوں گا مگر پھر کس کا کہا مانوں؟ آپ کا؟ سو آپ کو بھی تو فلاں مولانا کافر کہتے ہیں، اس کا کیا علاج؟ غرض ہندوستانی عالموں اور جاہلوں کا وہاں بھی یہی خراب حال اور لڑائی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

سرسید کی مخالفت اگر محض دینداری اور حمیت اسلامی کی بنیاد پر کی جاتی، تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی بلکہ اس کا نہ ہونا تعجب تھا کیونکہ اس سے پایا جاتا کہ مسلمانوں کو دین و مذہب کی کچھ پرواہ نہ رہی۔ چنانچہ اسی خیال سے سرسید اکثر کہا کرتے تھے کہ جو لوگ میرے مخالف ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اسلام کے برخلاف ہوں اور میرے خیالات سے اسلام کو نقصان پہنچتا ہے پس جو کچھ کہ وہ اپنی دانست میں اس خیال سے کرتے ہیں اس پر وہ بزرگ تعریف کے لائق ہیں نہ مذمت کے" مگر افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ زیادہ مخالفتیں محض نفسانیت، خود غرضی یا عناد پر مبنی ہوتی تھیں اور اسی لئے بجائے اس کے کہ سرسید کے اقوال جو انہوں نے مذہبی مسائل کے متعلق جمہور کے خلاف لکھے ہیں راست راست بے کم و کاست بیان کئے جاتے، بیسیوں باتیں ان کی نسبت غلط مشہور کی گئیں، ان کی تفسیر کی نسبت اس بات کو عموماً شہرت دی گئی کہ سید احمد خاں نے قرآن کے تیس پاروں میں سے دس چھانٹ لئے ہیں اور بیس نکال ڈالے۔ اکثر یہ بھی سنا گیا کہ انہوں نے سورۃ الرحمٰن

میں فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ صرف ایک جگہ رکھا ہے، باقی مکرر سمجھ کر سورت میں سے نکال دیا ہے۔ حالانکہ وہاں تک تفسیر کی نوبت بھی نہیں پہنچی تھی۔

مولوی علی بخش خاں نے جو ایک کتاب موسوم بہ تائید الاسلام سرسید کے خلاف لکھی تھی اور جس کی بہت سی جلدیں وہ عرب میں شائع کرنے کو لے گئے تھے۔ اس میں بے شمار عقائد سرسید کی طرف ایسے منسوب کئے گئے ہیں جو بالکل خلافِ واقع ہیں۔ مثلاً یہ کہ مادہ مثلِ ذاتِ باری تعالیٰ خود مادّی ہے یا یہ کہ باوجود قانونِ قدرت کے بعثتِ انبیاء کی ضرورت نہیں۔ یا یہ کہ جب علوم جدیدہ یا انگریزی پڑھنے سے معلوم ہو کہ مذہب اسلام میں ضعف پیدا ہو گا تو مذہب اسلام کا ترک کر دینا لازم ہے۔ یا یہ کہ نبوتِ انبیاء سابقین یا کتب سماویہ کے انکار سے۔ یا معاذ اللہ قرآن شریف کے عمداً بول و براز میں آلودہ کرنے یا اس کے پھینکنے سے یا حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھیرانے سے یا معاذ اللہ کسی نبی کو گالی دینے سے یا بہشت دوزخ اور قیامت کے انکار سے، یا ضرورتِ دین کے انکار سے، آدمی کافر نہیں ہوتا، یا یہ کہ گرمی کے موسم میں رمضان کے تیس روزے فرض نہیں ہو سکتے۔ یا تھوڑی سی شراب جو بچا متوالا نہ کر دے۔ یا اتنا جوا کھیلنا جو بے قید نہ بنا دے حرام نہیں ہو سکتا۔ یا یہ کہ صلوٰۃ سے مراد مطلق دعا پڑھ لینی ہے اور وہی واسطے ادائے فرض کے کافی ہے۔ باقی جو ترکیب صلوٰۃ پنجگانہ کی مقرر ہے۔ وہ اصول مخترعہ علماء کا اتباع ہے۔ اسی طرح اور بہت سے اتہامات سرسید کی نسبت کتاب مذکور میں کئے گئے ہیں جن کو سرسید نے اپنے مضمون واقع البہتان میں ایک ایک کر کے لکھا ہے اور ہر ایک کے تحت میں یہ فقرہ لکھتے جاتے ہیں کہ "لعنۃ اللہ قائلہ و علیٰ معتقدہ"۔

مذہبی عقائد اور اقوال کے سوا اور طرح طرح کے اتہامات اس خیر خواہ خلائق پر لگائے جاتے تھے اس بات کا تو سرسید کی وفات تک ہزاروں آدمیوں کو یقین تھا کہ انہوں نے اپنا سر دس ہزار روپے کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اکثر لوگ سمجھتے تھے کہ بعد مرنے کے انگریز ان کا سر کاٹ کر لندن لے جائیں گے اور لندن کے عجائب خانہ میں رکھیں گے۔

ایک بار یہی سر بیچنے کا تذکرہ سرسید کے سامنے ہوا، اس وقت راقم بھی موجود تھا۔ اس مرحوم نے نہایت کشادہ دلی کے ساتھ فرمایا کہ جو چیز خاک میں مل کر خاک ہو جانے والی ہے اس کے لئے اس سے زیادہ اور کیا عزت ہو سکتی ہے کہ دانش مند لوگ اس کو روپیہ دے کر خریدیں، اس کے ڈسیکشن سے کوئی علمی نتیجہ نکالیں اور اس کی قیمت کا روپیہ قوم کی تعلیم میں کام آوے، دس ہزار چھوڑ دس روپے بھی اگر اس کی قیمت میں ملیں تو میرے نزدیک مُفت ہیں۔

منجملہ ان بے شمار اتہامات کے جو سرسید پر لگائے جاتے تھے ایک وہ صریح بہتان تھا جو سنہ ۱۸۷۶ء میں بمقام بنارس ان پر لگایا گیا۔ سرسید کے پنشن لے کر علی گڑھ آنے سے چند مہینے پہلے جب کہ حضور پرنس اوف ویلز بنارس تشریف لائے۔ ان کی تشریف آوری کی یادگار میں ایک شفاخانہ بنارس میں بننا تجویز ہوا تھا اور جو کمیٹی یادگار قائم کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی اس کے ایک ممبر سرسید بھی تھے۔ کمیٹی کی درخواست پر میونسپلٹی بنارس نے شفاخانہ کے لئے ایک قطعہ زمین دینا تجویز کیا جس میں علاوہ اور کچے گھروں کے ایک چھوٹا سا خام چبوترہ بھی تھا جس کو مسلمانوں نے نماز پڑھنے کے لئے عارضی طور پر بنا لیا تھا۔ میونسپلٹی نے تجویز اس میدان کو صاف کرا دیا اور جس طرح اور گھروں کے مالکوں کو کمیٹی یادگار سے معاوضہ دلوایا تھا اسی طرح اس چبوترے کے معاوضہ میں ۳۲ روپے دینے تجویز ہوئے۔ سرسید نے اس خیال سے کہ یہ قلیل رقم مسلمانوں کے کس کام آئے گی۔ نواب لفٹننٹ گورنر سے جو ان دنوں بنارس آئے ہوئے تھے عرض کر کے اسی میدان کے قریب مسجد کے لئے ایک دوسرے قطعہ کے ملنے کی اجازت دلوادی اور شفاخانہ کے چندے میں ڈھائی ہزار روپیہ مسلمانوں کو دلوا کر وہاں مسجد تعمیر کرا دی۔ بنارس کے مسلمان سرسید کے نہایت شکر گذار ہوئے اور مسجد کے پیش طاق پر یہ عبارت کندہ کرانی تجویز کی۔

در آوان سعید واز برائے طاعت یزداں　　بنا گردید ایں مسجد ز سعی سید احمد خاں

مگر سرسید نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور اس بیت کے کندہ کرانے کی اجازت نہیں دی۔

بنارس میں تو یہ کارروائی ہو رہی تھی اور تمام ہندوستان کے دیسی اخباروں میں یہ لکھا جا رہا تھا کہ سید احمد خاں نے شفاخانہ کے واسطے مسجد منہدم کرا دی۔ یہ شور و شغب ایک مدت تک ہندوستان کے نالائق اخباروں میں رہا مگر سرسید نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اور اصل حال سے اخباروں کو مطلع نہیں کیا۔ آخر سوسائٹی اخبار کے اڈیٹر نے ایک پرچہ میں لکھ دیا کہ ہم اصل حالات دریافت کر کے اپنے اخبار میں چھاپیں گے سرسید نے اڈیٹر کی یہ تحریر اخبار میں دیکھ کر اس کو لکھ بھیجا کہ مجھ پر سے الزام رفع کرنے کے لئے آپ اخبار میں کچھ نہ لکھیں اور اخبار نویسوں کو بکنے دیں۔ چند روز بعد اڈیٹر کی شکایت اخباروں میں چھپنی شروع ہوئی کہ جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہ کیا۔ کیونکہ سرسید سے الزام رفع کرنے کا کوئی پہلو ہاتھ نہ آیا۔ آخر علی گڑھ اخبار کے اڈیٹر نے مجبور ہو کر ۲۶ مئی ۱۸۷۶ء کے پرچہ میں تمام حال اول سے آخر تک بحوالہ کاغذات مثل میونسپلٹی بنارس کے تحریر کیا۔

اسی طرح بیسیوں اتہام سرسید پر، مدرستہ العلوم پر، اس کے طالب علموں پر لگائے جاتے تھے، مدرسہ کی نسبت ایسی خبریں اڑائی جاتی تھیں جن سے لوگوں کے دل میں نفرت پیدا ہو یا اس کے معاونوں کو رنج اور

مخالفوں کو خوشی ہو۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک ننگِ اسلام داہل اسلام نے مشہور کر دیا کہ جس کوٹھی میں بائی اسکول کی جماعتیں پڑھتی ہیں اس کی چھت گر پڑی اور بیس تیس طالب علم اس کے نیچے دب گئے۔ اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں، مگر جو مثل مشہور ہے کہ "اپنا گھٹنا کھولئے اور آپ ہی لاجوں مریئے" ایسی باتیں کرنے سے سوا اس کے کہ اپنی اور اپنی قوم کی نالائقی سارے زمانہ میں مشہور ہو اور کوئی نتیجہ معلوم نہیں ہوتا۔ . . . . . .

سب سے زیادہ سرسید کا ذکرِ خیر پنج اخباروں میں ہوتا تھا۔ جن کے اڈیٹر اور پروپرائٹر عموماً مسلمان تھے اور گرم بازاری اس بات پر منحصر تھی کہ اپنی قوم کے جان نثار اور خیر خواہ پر پھبتیاں اڑائیں، اس کے کارٹون بنائیں، اس کی ہجو کے اشعار شائع کریں۔ اس کی خوبیوں کو عیب بنا کر دکھائیں اور اس طرح نہ صرف آپ کو بلکہ تمام قوم کو جس کے مذاق پر اخباروں کی بُرائی بھلائی کا انحصار ہے دنیا میں رسوا اور بدنام کریں۔ سرسید بھی ان اخباروں کے آوازے توازے سنتے سنتے ان کے عادی ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ جس اخبار میں ان پر کوئی چوٹ نہ ہوتی تھی اس کو دیکھ کر تعجب کرتے تھے۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق میں ایک جگہ لکھتے ہیں "ہمارا حال تو اس بڑھیا کا سا ہو گیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی کیا آج بازار کے لونڈے مر گئے؟"۔

جو مسلمان سرسید کے مخالف تھے وہ بھی انگریزوں کی اس مخالفت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مولوی امداد العلی اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں "بعض اہالیانِ ہند نے واسطے دھوکہ دینے حکام وقت کے اپنا طریقہ مذہبی اور لباس ملکی اور وضع قومی چھوڑ کر برخلاف اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں اور ہم پیشوں کے جاکٹ اور کوٹ پتلون پہنتا اور میز و کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا اس مراد سے اختیار کیا ہے کہ ہم کو حکام وقت جن کے لباس اور طعام کی یہ وضع ہے، اپنا مخلص اور مطیع اور پیرو جانیں اور انکے محکومین ہم کو حکام کا ہمسر مانند صاحب لوگوں کے سمجھیں سو نتیجہ اُنکے خبث طینت کا مکرر رہا ہے یوں ظاہر ہے کہ اکثر حکام سوائے فریبی دغاباز سمجھنے کے انکو اچھا نہیں جانتے اور انکی وضع اور چال چلن کو پسند نہیں کرتے"

باوجود ان مخالفتوں کے جو مسلمانوں کی طرف سے ہوتی تھیں سرسید نے جو ان کے مقابلہ میں ابتدا سے خاموشی کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ بغیر اشد ضرورت کے کبھی اس کو ترک نہیں کیا۔ نہ وہ خود جواب دینا چاہتے تھے اور نہ کسی دوست کا اپنی طرف سے جواب دینا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی بہت سی تحریریں دیکھی گئی ہیں جن میں انہوں نے اپنے دوستوں کو مخالفوں کا جواب دینے سے روکا ہے۔ بلکہ ایک دفعہ خود راقم کو ایک اسی قسم کی تحریر اخباروں میں چھپوانے پر نہایت شرمندہ کیا، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کو اپنی سچائی پر کس قدر بھروسا تھا اور کہاں تک وہ سلف کے اس سچے مقولہ پر یقین رکھتے تھے کہ "مَا ذَلَّ ذُوْحَقٍّ وَلَوْ تَفَقَ الْعَالَمُ عَلٰی خِلَافِہٖ"۔

سینکڑوں دہریے اور کمیونسٹ

نوجوان، جو مذہب سے برگشتہ ہو چکے تھے ان دو کتابوں کے پڑھنے سے
اسلام کے گرویدہ ہو گئے یعنے

سلیم کے نام خطوط

جن میں ان تمام سوالات کا نہایت مدلل، اطمینان بخش اور بصیرت افروز جواب دیا گیا ہے جو ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق پیدا ہوتے رہتے ہیں انداز بیان نہایت شگفتہ اور دل نشین ہے۔ یہ خطوط نہیں، بلکہ اسلام کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔

قیمت جلد اول۔ آٹھ روپے جلد دوم۔ چھ روپے جلد سوم۔ چھ روپے

دوسری کتاب کا نام ہے

انسان نے کیا سوچا

سقراط اور افلاطون سے لے کر برٹرینڈ رسل اور ٹوئن بی تک، مختلف مفکرین، مدبرین مورخین اور سائنسدانوں نے کائنات اور انسانی دنیا کے جو خیالات پیش کئے ہیں انہیں اس انداز میں سامنے لایا گیا ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ انسان وحی کی راہ نمائی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ عجیب غریب کتاب ہے۔

قیمت ——— بارہ روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ - بی گلبرگ - لاہور

بچوں کا صفحہ

عید میلاد النبیؐ

عید میلادالنبیؐ کی شام ایک بچے اور اس کی والدہ کے درمیان حسب ذیل گفتگو ہوئی۔ اسے پیارے بچو! بڑی توجہ سے پڑھو۔

بیٹا۔ امی جان! ہمیں بھی موم بتیوں کے بکس منگا دیجئے۔ ہم انہیں رات کو اپنی چھت پر جلائیں گے۔

ماں۔ بیٹا! موم بتیاں تو میں تمہیں منگا دونگی لیکن مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم انہیں کیوں جلانا چاہتے ہو

بیٹا۔ امی جان! اس میں بھلا پوچھنے کی کیا بات ہے۔ سب لڑکے اپنے اپنے ہاں موم بتیاں جلائیں گے۔ اس لئے ہم بھی جلائیں گے۔

ماں۔ بیٹا! یہ تو کوئی معقول بات نہ ہوئی کہ چونکہ سب لڑکے ایسا کریں گے اس لئے تم بھی ویسا ہی کرو گے۔ میں نے تمہیں کتنی مرتبہ سمجھایا کہ جو کام کرو خود سمجھ سوچ کر کرو۔ یہ نہیں کہ جو کچھ دوسرے کر رہے ہیں، تم بھی بلا سوچے سمجھے وہی کچھ کرنے لگ جاؤ۔ تم خود سوچ کر بتاؤ کہ آج رات موم بتیاں کیوں جلائی جائیں گی۔

بیٹا۔ امی جان! کہتے ہیں کہ آج ہمارے رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس لیے ہم اس خوشی میں روشنی کرتے ہیں اور جشن مناتے ہیں۔

ماں۔ ٹھیک ہے بیٹا! بات یہی ہے۔ لیکن اس کے بعد سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم رسول مقبولؐ کے یوم پیدائش پر خوشی کیوں مناتے ہیں

بیٹا۔ اس کا تو امی جان! مجھے علم نہیں۔ یہ بات آپ بتائیے۔

ماں۔ سنو بیٹا! غور سے سنو۔ یہ بڑی ضروری بات ہے۔ تم ذرا سوچو کہ ایک شخص اندھا ہو۔ اسے کچھ نظر

نہ آئے۔ اس کی زندگی سخت مصیبت میں گذر رہی ہو۔ کہ اتنے میں اس گاؤں میں کہیں سے ایک ڈاکٹر آ جائے۔ وہ اس کی آنکھوں کا علاج کرے اور وہ اچھا ہو جائے۔ اسے سب کچھ نظر آنے لگ جائے۔ کہو کہ یہ دن اس اندھے کی زندگی میں یادگار منانے کے قابل ہوگا یا نہیں! کیا وہ اس دن کی یاد میں جشن مسرت منائے گا یا نہیں؟

بیٹا۔ یہ بات تو ٹھیک ہے امی جان! وہ ضرور اس دن کی یاد میں جشن منائے گا۔ لیکن اس بات کا عید میلاد النبیؐ سے کیا تعلق ہے!

ماں۔ بڑا گہرا تعلق ہے بیٹا! ہمارے رسولؐ خدا کے آنے سے پہلے دنیا میں کہیں بھی خدا کی تعلیم کی روشنی نہیں تھی۔ ساری دنیا اندھیرے میں تھی۔ کسی کو صحیح اور غلط راستے کی تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ لوگ جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتے تھے۔ کوئی کسی بات کو سچ مان لیتا کوئی کسی بات کو۔ لیکن کسی کے پاس ایسی کسوٹی نہیں تھی جس سے جھوٹ اور سچ۔ غلط اور صحیح میں تمیز ہو سکتی۔ ہمارے رسولؐ خدا نے آ کر خدا کے علم کی روشنی ساری دنیا میں پھیلا دی۔ ہر ایک کی آنکھیں کھل گئیں۔ جھوٹ اور سچ صاف صاف طور پر الگ ہو گیا۔ غلط اور صحیح میں تمیز ہو گئی۔ یہ روشنی خدا کی کتاب۔ قرآن شریف ہے جو سورج کی طرح روشن ہے۔ ہم اس لئے خوشیاں مناتے ہیں کہ ہمیں ہمارے رسول نے، اس طرح کی روشن کتاب دی جس سے ہماری آنکھوں میں بینائی آ گئی۔

کیوں بیٹا! اب تم سمجھے کہ عید میلاد النبیؐ پر اسقدر خوشیاں کیوں منائی جاتی ہیں؟ جاؤ! اب تم موم بتیاں لے آؤ۔ لیکن ایک بات کا وعدہ کرو۔ اور وہ یہ کہ جو باتیں میں نے تمہیں بتائی ہیں تم انہیں ان تمام لڑکوں کو بتاؤ گے جو تمہاری موم بتیاں دیکھنے آئیں گے

بیٹا۔ ہیں امی جان! ضرور ایسا کروں گا۔

عنقریب آنے والی کتابیں

۱- مقامِ حدیث وہ کتاب جس نے قرآن کریم اور احادیث نبویؐ کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے ذہنوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے اٹھا دیئے۔ یہ بڑی مقبول کتاب تھی لیکن اس کا پہلا ایڈیشن ایک عرصہ سے ختم ہو چکا تھا۔ پہلے یہ دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ اب اسے پوری نظرثانی اور ترمیمات کے بعد ایک ہی جلد میں شائع کیا جا رہا ہے۔

۲- اسلامی معاشرت اس نہایت مفید کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ایک عرصہ سے نایاب تھی۔ اب اسے مصنف کی نظرثانی کے بعد، بڑی احتیاط سے شائع کیا جا رہا ہے۔

۳- آسمانی کتابوں کی کہانی

پرویز صاحب کی مایہ ناز تصنیف "معراج انسانیت" کے پہلے باب (ظہر الفساد) میں دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کی مبینہ آسمانی کتابوں کی سرگزشت بڑی تحقیق کے ساتھ دی گئی تھی۔ "معراج انسانیت" مدت سے نایاب ہے۔ (اس کے جدید ایڈیشن کی اشاعت زیرغور ہے) قارئین کے تقاضے پر اس باب کو، مصنف کی نظرثانی کے بعد، ایک الگ کتاب کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں ایک باب، خود قرآن کریم کی جمع، تدوین اور حفاظت کے متعلق بڑھا دیا گیا ہے۔

ان کتابوں کی کتابت ہو چکی ہے۔
عنقریب شائع ہو جائیں گی۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ (۲) - لاہور

حقائق و عبر

۱۔ اولیاء اللہ

موقر جریدہ "الاعتصام" جمعیت اہل حدیث کا ترجمان ہے جن کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ "پیروں فقیروں" کے قائل نہیں ہوتے۔ اس اخبار کی ۲۱ مئی ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں "چند ملے اولیاء اللہ کی مجلس میں" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے۔ آپ اسے پڑھئے اور پھر سوچئے کہ یہ تعلیم ان حضرات کی طرف سے دی جاتی ہے جو اتباع سنت رسول اللہ کے اس شد و مد سے مدعی ہیں۔

فقیری میں بادشاہی

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں حج پر گیا۔ وہاں کسی نے مجھے بتایا کہ یمن میں ایک شخص ہے جو خدا کے خوف اور عبادت میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھے اس کی ملاقات کا شوق غالب آیا، حج کے بعد دوستوں کے ہمراہ یمن کا ارادہ کیا تاکہ ہم اس بزرگ کی صحبت سے فائدہ حاصل کریں۔ ہمارے قافلہ کے ہمراہ ایک بزرگ سیرت نوجوان بھی تھا جس کے چہرے سے خوف الٰہی کے انوار چمک رہے تھے۔ اس کا رنگ بوجہ فاقوں کے زرد تھا۔ اس کی مغموم طبع سے یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ کسی زبردست (حادثہ؟) کا شکار ہے۔ ہم نے اسے سمجھایا کہ تم اپنی جان پر رحم کرو اور اتنا غم نہ کھاؤ لیکن وہ ہماری کسی بات پر کان نہ دھرتا تھا۔ یہاں تک کہ ہم پہنچ گئے۔

بزرگ کو دیکھا وہ نہایت عاجز اور مسکین مزاج تھے۔ اس نوجوان نے ہم سب سے پہلے اس بزرگ کو سلام کیا اور کہا۔

"اللہ تعالیٰ نے آپ کو دلوں کی بیماری کا طبیب بنایا ہے اور گناہوں کے درد آپ کے علاج سے دور ہو جاتے ہیں، للہ! میرا علاج کیجئے میرا ایک زخم ناسور بن چکا ہے۔ اس کی درد ٹھہر چکی ہے، میں لاعلاج مریض ہوں"۔

شیخ نے جواباً کہا:۔ "اے نوجوان جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو پوچھو"!

جوان نے عرض کیا:۔ "فرمائیے اللہ تعالیٰ کے خوف کی کیا علامت ہے"؟

شیخ نے فرمایا:۔ "بندے میں جب خدا کا خوف آجاتا ہے تو وہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا اور مخلوق سے نڈر ہو جاتا ہے"۔

یہ سن کر جوان کانپتے کانپتے بے ہوش ہو گیا، تھوڑی دیر بعد ہوش سنبھال کر بولا۔

"اے شیخ فرمایئے۔ بندے کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا کب یقین ہوتا ہے"؟

شیخ نے فرمایا: "بندے کو اپنے اندر خدا کے خوف کا یقین اس وقت کرنا چاہئے جب وہ دنیوی حرصوں سے اس طرح پرہیز کرنے لگے جس طرح بیمار کھانا کھانے سے پرہیز کرتا ہے"۔

یہ جواب سُن کر جوان نے زبردست چیخ ماری، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی جان ہوا ہو جائے گی پھر سنبھل کر بولا اے شیخ فرمایئے:۔ خدا کی محبت کی کیا علامت ہے؟

شیخ نے فرمایا: "جب بندہ جزا اور انعام کا شوق چھوڑ کر اللہ کی عبادت خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی خاطر کرتا ہے، تو اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کا حبیب شمار ہونے لگتا ہے"۔

شیخ کے الفاظ سن کر نوجوان زور زور سے چیخا اور چلایا، حتیٰ کہ اس کی جان نکل گئی۔

شیخ روتے روتے اٹھے اور اس نوجوان کا بوسہ لے کر کہا: "یہ خدا کا سچا دوست تھا جو ہم سے جدا ہو گیا ہے اس کی روح اللہ تعالیٰ کی عاشق تھی، جو خدا کی مزید جدائی برداشت نہ کر سکی"۔

من کی دولت

ابراہیم بن بشار علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ابراہیم بن ادھم رح کے ساتھ تھا ہم روزے سے تھے اور ہمارے پاس افطاری کے لئے کچھ نہ تھا اور نہ ہی مزدوری کی کوئی صورت نظر آتی تھی۔ ابن ادھم رح نے مجھے غمزدہ دیکھ کر فرمایا:۔

"اے ابن بشار! فقر پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہوتی ہے۔ دنیا و آخرت میں یہ لوگ خدائی راحتوں کے سائے میں جیتے ہیں۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ نہ تو فقراء سے زکوٰۃ کے بارے میں بات کریگا اور نہ ہی حج و صدقہ پر ان سے باز پرس ہو گی"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فقراء اغنیاء سے چالیس سال پہلے جنت میں پہنچ جائیں گے"۔

گویا امیر لوگ چالیس سال میدان حشر میں حساب کے لئے کھڑے رہیں گے۔

پھر فرمایا: "بلاشبہ جو لوگ دنیا میں دولت مند ہیں وہ آخرت میں فقیر ہوں گے، جو دنیا میں مرتبے والے ہیں وہ قیامت کو خوار ہوں گے"۔

"اے ابن بشار! دنیا میں فقراء امیروں کے بادشاہ ہیں، کیونکہ امیر لوگ حرص کے غلام ہیں، اور حرص و لالچ فقیروں کی لونڈی ہے، تو اس طرح وہ فقراء کے غلام کے غلام ہیں۔ فقیروں نے دنیا و آخرت میں عیش و راحت کو اپنا لیا ہے، ان کا معاملہ جب کہ خدا تعالےٰ سے درست ہے، تو ان کی کوئی پرواہ نہیں، چاہے ان کے صبح و شام کسی طرح بھی گزرے، غم اور رنج ان بزرگوں کے قریب نہیں پھٹکتا۔ یہ کہہ کر ابن آدم نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ تھوڑا ہی وقت گذرا ہو گا کہ اچانک ایک شخص کچھ روٹیاں اور کھجوریں لے کر آیا، انہیں میرے سامنے رکھ کر کہنے لگا:۔

"خدا کا دیا ہوا رزق ہے نوش جان فرمائیے"

ابن بشار کہتے ہیں، میں انہیں سامنے رکھ کر بیٹھا رہا، یہاں تک کہ ابراہیم ادہمؒ نماز سے فارغ ہوئے مسکرا کر مجھ سے مخاطب ہوئے:

"اے مغموم! اے حزین خوب کھاؤ"

اسی اثناء میں ایک سائل آگیا اور خدا کا واسطہ دے کھانا مانگا۔ ابن ادہمؒ نے کچھ کھانا اور کھجوریں اس کے حوالے کر دیں اور باقی مجھے کھانے کو کہا اور خود کچھ نہ کھایا اور یہ کہہ کر پھر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے:

"خیر خواہی ہمیشہ سے ایمان داروں کا شیوہ رہا ہے"

طلوع اسلام

کس قدر صحیح کہا تھا اقبال نے ارمغانِ حجاز میں، اپنی مشہور نظم ــــ ابلیس کی مجلس شوریٰ ــــ میں کہ مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے اس سے زیادہ موثر طریقہ اور کوئی نہیں کہ۔

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اسکے سب مہرے ہوں مات
خیر اس میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اسکی آنکھوں سے تماشائے حیات

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

بائبل

مشہور جریدہ لائف نے (۱۹ اپریل کو) اپنا ایک خاص نمبر شائع کیا ہے جو بائبل سے متعلق مقالات اور تصاویر کے لئے مختص ہے۔ اس کے مقالہ افتتاحیہ کا پہلا پیراگراف یہ ہے:

"بین الاقوامی جریدہ لائف کا یہ شمارہ ایک کتاب سے متعلق ہے ــــ وہ کتاب جو انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اور اثر انگیز ہے۔ لیکن بایں ہمہ وہ کتاب انسانوں کی تحریر کردہ ہے۔ اس کے مصنفین میں۔ اسعیاہ حزقیل، یرمیاہ اور سینٹ پال جیسے مشہور نام ملتے ہیں۔ لیکن اس کا بیشتر حصہ ایسے لوگوں کا لکھا ہوا ہے جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ اس لئے کہ (حضرت) ابراہیم سے قریب ایک ہزار سال بعد تک، خدا کی وحی باپ سے بیٹے کی طرف زبانی منتقل ہوتی رہی۔ اس کا کوئی حصہ بھی ضبط تحریر میں نہیں لایا گیا۔ جب قریب ۱۰۰۰ ق۔م میں عبرانیوں نے اپنی سابقہ کہانیوں اور نظموں کو لکھنا شروع کیا اور ان میں نئے اضافے بھی کئے تو ان کے نوشتوں کی بار بار نقلیں

کرنی پڑتی تھیں جن میں متعدد تبدیلیوں کا امکان تھا ــــ بعض بالمقصد اور بعض سہواً۔ جب عیسائیت پھیلی تو ان صحیفوں کی نقول کی مانگ اور بھی بڑھ گئی۔ بالخصوص عہد نامۂ جدید کی۔ تو بہت سے عقیدت مندان نے اپنی اپنی نقول مرتب کیں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک شخص اپنا صحیفہ اونچی آواز سے پڑھتا جاتا تھا اور درجنوں ناقل اسے لکھتے جاتے تھے۔ اس سے غلطیوں کا امکان اور بھی زیادہ ہو گیا۔ لہٰذا اب حالت یہ ہے کہ بائبل کے کسی صحیفے کی اصل کہیں بھی موجود نہیں اور عہد جدید (انجیل) میں عہد عتیق سے بھی زیادہ تبدیلیاں ملتی ہیں۔

یہ ہے کہانی خود اس کتاب کے ماننے والوں کی زبانی ــــ اس کتاب مقدس کی جس کے متعلق یہ مانا اور منوایا جاتا ہے کہ وہ خدا کی وحی ہے جس پر ایمان لائے بغیر انسان کی نجات نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کیسے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ یہود اور نصاریٰ کی آسمانی کتابوں میں بے حد تحریف ہو چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آسمان کے نیچے قرآن کریم کے علاوہ کوئی (بعینہٖ) آسمانی کتاب بھی اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہیں۔

یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔

محبوب سبحانیؒ کا طریقۂ نماز

محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانیؒ کی ذات والا صفات تمام مسلمانوں کے نزدیک مستحق تعظیم و تکریم ہے آپ کی قدر و منزلت، عقیدت اور محبت ہر گوشۂ قلب میں جاگزیں ہے اور یقیناً آپ سے محبت و الفت باعثِ ثواب، اور آپ سے بغض و عداوت باعثِ عذاب الٰہی ہے۔

آپ کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اسی طرح نماز ادا کریں جس طرح آپ نے ادا کی۔ اسی غرض سے یہ مختصر رسالہ لکھا گیا ہے اور اس میں آپ کی نماز کا طریقہ تحریر کیا گیا ہے تاکہ محبان پیر اپنی نمازیں اپنے محبوب پیر محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانی کے طریقہ پر ادا کریں۔

پیش نظر آپ کی معرکۃ الآراء تصنیف:۔ "غنیۃ الطالبین" مطبوعہ لاہور کا ہے۔ دعاء ہے.... کہ مسلمانوں کی نمازیں محبوب سبحانیؒ کے فرمائے ہوئے طریقے کے مطابق ہوں اور ہر اس آدمی سے جو آپ کے طریقہ پر نماز ادا کرتا ہو محبان پیر کی دلی محبت ہو۔

یہ اقتباس "اہل بدعت" کے کسی صحیفہ سے نہیں لیا گیا۔ یہ لیا گیا ہے جمعیت اہل حدیث کے ترجمان "الاعتصام" کی ۸ مئی ۱۹۶۵ء کی اشاعت سے جو اتباع سنت رسول اللہ کے سب سے بڑے اور متشدد داعی ہیں۔ ان حضرات کی اب دعوت یہ ہے کہ مسلمان اسی طرح نماز ادا کریں جس طرح

حضرت پیر عبدالقادر جیلانی نے ادا کی تھی۔ الاعتصام میں یہ چیز محض مناظرانہ رنگ میں کہی گئی ہے کیونکہ اس کے بعد حضرت پیر صاحب کا جو طریقہ نماز بتایا گیا ہے وہ اہل حدیث کے طریقے سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسی اصول کے ماتحت (کہ مسلمانوں کو اپنے پیروں کے طریقے کے مطابق نماز ادا کرنی چاہئے) اگر کوئی چشتیہ خاندان کا مرید یہ ثابت کر دے کہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کا طریق نماز حنفیوں کے مطابق تھا تو کیا اہل حدیث حضرات ان کے طریقہ نماز کو واجب الاتباع تسلیم کریں گے؟

دین میں شخصیت پرستی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

کیا آپ کو اتنی فرصت ہے؟

کہ آپ گزشتہ اڑھائی ہزار سال کے مختلف مفکرین، مؤرخین سیاسی مدبرین، مذہبی مصنفین اور نامور سائنسدانوں کے خیالات کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان سب کا رجحان کس طرف ہے

آپکو فرصت نہیں ہو سکتی!

آپ کیلئے یہ کام اس معرکۃ الآراء کتاب نے کر دیا ہے جس کی نظیر دنیا کی کسی زبان میں بھی نہیں مل سکتی۔ اس کتاب نے اتنا ہی نہیں کیا کہ دنیا بھر کے آئمہ فکر و نظر کے خیالات یکجا جمع کر دیئے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ انسانی عقل، کس طرح خدا کی وحی کی محتاج ہے۔ اس عجیب و غریب کتاب کا نام ہے۔

اِنسان نے کیا سوچا

ضخیم کتاب۔ سفید کاغذ، ٹائپ کی طباعت۔ حسین اور پائیدار جلد۔ قیمت:- ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ:- ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

طاہرہ بیٹی کا جواب

[طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۶۵ء میں ایک طاہرہ بیٹی کا خط شائع ہوا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ ہمارے معاشرہ میں لڑکیوں کے لئے مناسب رشتہ کا ملنا کس قدر مشکل ہوگیا ہے۔ اس خط کا جواب "ایک طاہرہ بہن کی طرف سے موصول ہوا جو جولائی کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اب اس کا جواب، اُس طاہرہ بیٹی کی طرف سے شائع کیا جاتا ہے۔ طلوع اسلام]

محترمہ بہن۔ سلام و رحمت۔

جولائی ۱۹۶۵ء کے طلوع اسلام میں آپ کا مشفقانہ محبت نامہ نظر سے گذرا۔ میں آپ کی ہمدردی اور ناصحانہ مشورہ کے لئے شکر گذار ہوں، لیکن برا نہ مانیں تو عرض کروں کہ آپ نے ــــ تسلی میں بھی تخم غم بو دئے ــــ آپ نے لکھا ہے کہ

(۱) ایک "مالک" کا دستیاب ہوجانا کسی مشکل کا حل نہیں۔

(۲) شادی کرنا کچھ ایسا ضروری نہیں۔ اکثر اوقات (بلکہ بیشتر) شادی سے مزید الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

(۳) وہ عورتیں موجود ہیں جنہوں نے عمر بھر شادی نہیں کی اور انہیں کبھی کف افسوس نہیں ملنا پڑا۔

(۴) لہٰذا، اگر شادی کا انتظام نہ ہوسکے تو "صبر سے کام لینا چاہیئے" !!

میں نے اپنا پہلا خط بہت ڈرتے ڈرتے لکھا تھا ــــ اور بڑے ہی تذبذب کے بعد ــــ دل دھڑکتا تھا کہ اس سے کہیں کوئی غلط تاثر نہ لے لیا جائے۔ میرے دل کی یہ دھڑکن بے بنیاد نہ نکلی۔ یہ کہہ ہی دیا گیا کہ ــــ اگر شادی کا انتظام نہ ہوسکے تو صبر سے کام لینا چاہیئے۔

محترمہ بہن! مجھے معلوم نہیں کہ آپ کتنے عرصہ سے اپنے وطن سے باہر رہ رہی ہیں لیکن عرصہ خواہ دراز ہو یا مختصر، یہ حقیقت ہے (جس تک آپ کا خط پہنچا رہا ہے) کہ آپ اپنے وطن کو یقیناً بھول چکی ہیں۔ اگر آپ کو یہاں کے حالات کی تھوڑی سی یاد بھی رہتی تو آپ یہ کچھ نہ کہتیں۔ آپ نے انگلستان کے حالات کو سامنے رکھ کر یہ تو لکھ دیا کہ یہاں کتنی عورتیں ہیں جنہوں نے عمر بھر شادی نہیں کی اور انہیں کبھی کف افسوس ملنا نہیں پڑا۔ بلکہ وہ بہت مطمئن ہیں۔ لیکن ایسا لکھتے وقت آپ یہ قطعاً بھول گئیں کہ ہیں پاکستان میں ہوں، انگلستان میں نہیں۔ یہاں صورت یہ ہے کہ ایک عورت معاشی طور پر بھی خود کفیل ہو۔ اسے شادی کی بھی ضرورت نہ ہو۔ وہ معاشرہ کی اصلاح کے بیسیوں کام کر سکتی ہو اور کرنا چاہے بھی۔ لیکن اس کے باوجود، اسے شادی کرنی پڑتی ہے اس لئے یہاں عورت کے لئے عمر بھر مرد کی حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ لڑکی ہے تو باپ کی چھت کی۔ جوان ہے تو خاوند کی چھت کی، اور بوڑھی ہے تو بیٹے کی چھت کی۔ یہاں حالت یہ ہے کہ لڑکیاں، کسی مرد کی حفاظت کے بغیر اسکول اور کالج تک نہیں جا سکتیں۔ گھر سے باہر دس قدم سیر کے لئے تنہا نہیں نکل سکتیں۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر اکیلی بازار تک نہیں جا سکتیں۔ اگر وہ دست درازی سے محفوظ بھی رہ جائیں تو قدم قدم پر چشمکوں۔ سیٹیوں۔ فقرے بازیوں، بازاری قہقہوں۔ اوباشانہ گیت نوازیوں سے بچ کر نکل ہی نہیں سکتیں۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ کسی بیچاری کے نام کے ساتھ "مس" لکھا ہوا سامنے آجائے تو پوچھو نہیں کہ ان حضرات کے تصورات کس کس قسم کی انگڑائیاں لینے لگ جاتے ہیں، خواہ وہ شریف زادی عمر میں ان صاحبزادہ صاحب کی والدہ محترمہ سے بھی بڑی ہوں!

میری محترمہ بہن! یہ ہے یہاں کی وہ ضرورت (نہیں بلکہ مصیبت) جس کے لئے یہاں "مالک" کی تلاش ہوتی ہے۔ جس ملک کا مفکر اعظم یہ کہہ گیا ہو کہ

نسوانیتِ زن کا نگہبان ہے فقط مرد

اس ملک میں، مرد کی نگہبانی کے بغیر عمر کیسے بسر ہو سکتی ہے، خواہ قرآن شریف لاکھ کہتا رہے کہ شادی نہ کرنے سے عورت کے ایمان میں کچھ فرق نہیں آ سکتا۔ اور جب سوال صرف "نگہبان" تلاش کرنے کا ہو تو اس میں رفاقت کا کیا سوال ہے! ابا جان سنایا کرتے ہیں کہ ان کی بستی میں ایک بڑے شریف آدمی تھے لیکن بستی کے غنڈوں نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ انہیں اپنی جان کی طرف سے بھی خطرہ لاحق ہو گیا۔ تو انہوں نے کسی کے ہاں چوری کی۔

اقبال جرم کیا۔ اور جیل خانے بھیج دیئے گئے۔ ان سے جب جیل میں دوسروں نے پوچھا کہ انہوں نے اس قدر شرافت کے باوجود ایسا جرم کیوں کیا تو انہوں نے کہا کہ مجھے اپنی حفاظت کیلئے یہ مقام سب سے بہتر نظر آیا۔ اس لئے میں نے یہ جرم کیا۔ میری بہن! یہاں شادی کا جرم، جیل خانے میں جانے کے لئے کیا جاتا ہے کہ اس سے باہر عورت کو کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

اور جس سوختہ بخت کو یہ بھی میسر نہ آئے ——— ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے!

میری مشفق بہن! کیا آپ اس کا کوئی حل بتا سکتی ہیں؟

آپ کی شکر گذار

..... (طاہرہ)

مخالفین کا نیا حربہ اور ہماری گذارش

قارئین طلوع اسلام کی سہولت کے لئے ادارہ کی شائع کردہ کتابوں سے متعلق اسی صفحہ پر چسپاں ایک کارڈ آپ کے سامنے ہے۔ جیسا کہ ہم نے پچھلے شمارے میں وضاحت کی تھی، ادارہ کے مخالفین نے، ادارہ کو نقصان پہنچانے کے لئے یہ نئی حرکت شروع کر رکھی ہے کہ اس کارڈ پر یونہی نشان لگا کر کسی نہ کسی کے نام سے اسے حوالۂ ڈاک کر دیتے ہیں۔ اور نشان زدہ کتب جب بذریعہ وی۔ پی بھیجی جاتی ہیں۔ تو وہ واپس آجاتی ہیں۔ اس پریشان کن صورت حال کا اس کے سوا کوئی حل نظر نہیں آتا کہ جو حضرات ادارہ سے کوئی کتب منگانا چاہیں وہ کم از کم ایک چوتھائی رقم آرڈر کے ہمراہ پیشگی بھیج دیں۔ امید ہے کہ ہماری اس مجبوری کو پیش نظر رکھتے ہوئے متعلقہ حضرات یہ زحمت گوارا فرمائیں گے۔

والسلام

(ناظم ادارہ)